بَین
صدیق عالم

بَین

صدیق عالم

(افسانوں کا مجموعہ)

صدیق عالم

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

انتساب

صبا کے لیے۔۔۔

(ایک کھلونا جس کی چابی ایک دن میرے ہاتھ سے ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے گم ہوگئی۔)

فہرست

بَین

[جنگل کے اندر ساگوان کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھی وہ لڑکی ایک سوکھی ٹہنی سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ لکیروں کو بناتے وقت اس کی ٹہنی بار بار ٹوٹ جاتی اور وہ بچی ہوئی ٹہنی سے دوبارا کام شروع کر دیتی۔ وہ جو لکیریں کھینچ رہی تھیں وہ اتنی بے تکی بھی نہ تھیں۔ بہت جلد انھوں نے ایک بڑی کڑھائی کا روپ دھار لیا جو لبالب پانی سے بھرا ہوا تھا۔ گرچہ کڑھائی کو آگ نہیں دکھائی گئی تھی اس کے پانی سے دھوؤں کے مرغولے باہر آرہے تھے۔ شاید وہ یہی سوچ رہی تھی کیونکہ اس نے اس کے نیچے کچھ آڑی ترچھی لکڑیاں بنانی شروع کر دیں۔ ان لکڑیوں کو بنانا کوئی محنت کا کام نہ تھا، مگر جب وہ بن گئیں تو وہ دیر تک ان کو دیکھا کی۔ کتنی دیر تک؟ یہی کچھ دس منٹ، یا آدھا گھنٹہ، یا ایک سال، یا ایک صدی۔ وقت کی دھند سے باہر آ کر اس نے لکڑیوں کو آگ دکھائے بغیر ٹہنی کا بچا ہوا حصہ نیچے پھینک دیا اور اپنا سر پیچھے لے جا کر پیڑ کے تنے سے ٹکا دیا۔

ہوا پھننگوں میں قید ہے۔ اس کی پیٹھ زمین سے نکلی ہوئی عمودی جڑوں پر ٹکی ہونے کے سبب، اس کے بھاری پستان غیر معمولی طور پر ابھر آئے ہیں۔ اس کا گھنے

سیاہ بالوں سے ڈھکا سر شانوں سے پشت کی طرف ڈھلک گیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے بغیر سر کا ایک جسم پیڑ کے نیچے پڑا ہوا ہو۔

جانے کتنا وقت گذرا ہوگا۔ جب دور سے آتی ایک دقیانوسی موٹر سائکل کی آواز جنگل کے سناٹے کو توڑ دیتی ہے۔ یہ آواز تھوڑے فاصلے پر آ کر غائب ہوگئی ہے۔ جنگل ایک بار پھر سناٹے میں ڈوب گیا ہے۔ زیادہ وقت نہ گذرا ہوگا جب رہ رہ کر پتوں کے چرمرانے کی آواز ابھرنا شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی جنگل کے اندر چل رہا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں نہیں کھولتیں۔ مزید کچھ منٹ اور اسے اپنے داہنے کندھے پر ایک مضبوط ہتھیلی کے دباؤ کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ ایک لانبے قد کا دبلا پتلا لڑکا اپنا تاریک چشمہ اتار کر اس پر جھکا ہوا ہے۔

''یہ جگہ تمھارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ تمھیں یہاں اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''میں یہاں اکیلی نہیں ہوں!'' لڑکی اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ وہ لڑکے کی طرف تاکنے کی بجائے، اپنے دونوں گھٹنوں کو بازوؤں کے درمیان رکھ کر سامنے جنگل کے اندر تاک رہی ہے جہاں شاخوں اور ٹہنیوں سے چھن چھن کر گرتی سورج کی روشنی میں پیڑ کے تنے تیر رہے ہیں۔ ''میں اس جنگل میں کبھی اکیلی نہیں ہوتی۔]

○ ○ ○

یہ اسٹیم انجن کا زمانہ تھا جب دنیا پر راکھ اور بھاپ کی حکمرانی تھی۔

میرے چچا ریلوے میں نوکر تھے اور ہر کچھ سال بعد ان کا تبادلہ کسی دور افتادہ اسٹیشن میں ہو جایا کرتا۔ ان دنوں وہ اپنی ٹرین لے کر اڑیسہ کے پہاڑوں میں کچی دھات کی کانوں کی طرف جایا کرتے تھے۔ چونکہ ہمارے پاس جانے کے لیے اور کوئی دوسری جگہ نہ تھی، موقع ملتے ہی ہم لوگ ان سے ملنے چلے جاتے۔

ان دنوں وہ جس جگہ کام کر رہے تھے وہاں میرے لیے سب سے زیادہ حیران کن چیز تھی وہ پانی کا بڑا کنواں جس کی دیوار لوہے کی بنی تھی۔ اس کنویں کا پانی پمپ کے ذریعے اسٹیم انجنوں کے اندر ڈالا جاتا۔ میں نے اس زنگ خوردہ کنویں کے اندر پہلی بار جھانک کر دیکھا تو اس کے پانی میں آسمان کا ہالہ رہ رہ کر جھلک رہا تھا۔ بادی النظر میں کنویں کے اندر یہ ہلتا ہوا ہالہ ہی نظر آرہا تھا۔ مگر کچھ دیر تک غور سے دیکھتے رہنے کے بعد مجھے پانی میں بہت سارے سانپ کلبلاتے نظر آئے۔ ایک لوہے کی سیڑھی بھی دکھائی دی جو پانی کے اندر چلی گئی تھی۔ اس سیڑھی کے پائدان دیوار سے نکلے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر پرانے ہو کر ٹیڑھے میڑھے ہو گئے تھے بلکہ کئی تو ٹوٹ پھوٹ کر دیوار سے نیچے لٹک رہے تھے۔ گرمی کی دوپہروں میں، جب زمین کے اوپر کی چیزیں گرم ہوا اور دھوپ میں کمہلائی ہوئی نظر آتیں، کنویں کے اندر سے ایک عجیب طرح کی بدبو آتی جو ان چیل اور پہاڑی کووں کی بیٹ کی بو بھی ہو سکتی تھی جو کنویں کے اندر اتر کر گھنٹوں ان پائدانوں پر بیٹھا کرتے۔ یا یہ خود اس زنگ آلود پانی کی سڑاندھ ہو سکتی تھی جس کے اندر سانپ کلبلایا کرتے۔ یہ سوچ کر کہ ان پائدانوں سے پھسل کر کوئی انسان سانپوں کے درمیان جا گرے تو کیا ہوگا، میری ریڑھ کی ہڈی کے اندر ایک جھرجھری دوڑ جاتی۔

''ایسا واقعہ یہاں کبھی پیش نہیں آیا!'' میرے چاچا، جو انجن میں ڈرائیور تھے، اور جنھیں ہم ریل ابا کہہ کر بلایا کرتے، پہلی بار میرا تجسس دیکھ کر مسکرا اٹھے۔ ''ویسے ایسی ایک کہانی تو بنائی ہی جا سکتی ہے۔ بلکہ تم گھنٹوں جس طرح اس کنویں کے اندر جھانکتے رہتے ہو، تمھیں ایسی کسی کہانی میں یقین تو ضرور ہوگا؟''

ریل ابا کے بھرے بھرے گالوں پر گھنگریالی داڑھی اگی ہوئی تھی جنھیں وہ خضاب سے سرخ رکھتے تھے۔ ان کے دانت پرانے تانبے کی طرح بے رنگ ہو چکے تھے

جیسے ان پر بھی برسوں کی راکھ اور دھول جمی ہوئی ہو۔ شاید یہ بہت زیادہ سگریٹ نوشی کا نتیجہ تھا۔ وہ ہمیشہ سر پر ایک کیپ لگائے رہتے جسے ایک اینگلو انڈین گارڈ نے تحفے میں انھیں دیا تھا۔ انجن کے دھووں کے سبب اس کیپ کا اصلی رنگ کب کا مر چکا تھا۔ ریل ابا کی شراب نوشی کی لت اسی اینگلو انڈین کی دین تھی۔

یوں ریل ابا کافی ہٹے کٹے پہلوان نما انسان تھے، مگر میرے لیے ان کے جسم پر ایک اور ہی چیز تھی جو میرے لیے شروع ہی سے تجسس اور دلچسپی کا سامان بنی ہوئی تھی، وہ چیز تھی ان کا داہنا بازو جس پر ان کی رکھیل کا نام ہندوستانی میں گدا ہوا تھا۔

اس نام کے دیوناگری شبدوں کے گرد ایک نسوانی آنکھ کا پراسرار ہالہ بنا ہوا تھا جس کی دونوں طرف کی پلکیں کافی لانبی اور پرکشش تھیں۔ میری چاچی کو ان سب چیزوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ اس آنکھ کو ساری زندگی دیکھتی آئی تھیں مگر انھیں پتہ بھی نہ تھا کہ اس کے اندر کیا لکھا ہوا تھا۔ یا شاید اس دور کی دوسری عورتوں کی طرح انھیں اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ریل ابا کی بڑی لڑکی انگورا نے ایک دن میرے کان میں سرگوشی سے بتایا کہ وہ ایک قبائلی عورت کا نام ہے۔ اسے اس زبان سے واقفیت تھی کیونکہ پچھلی جگہ جہاں ریل ابا کی پوسٹنگ ہوئی تھی وہاں ذریعہ تعلیم صرف یہی زبان تھی۔ بعد میں ریل ابا کا تبادلہ نئی جگہ ہو جانے کے سبب وہ نہ صرف یہ زبان پوری طرح سیکھنے سے محروم رہ گئی تھی بلکہ اس کی تعلیم بھی ہمیشہ کے لیے رک گئی تھی۔

"میں اس عورت کو جانتا ہوں۔" میں نے جھوٹ کہا۔ "مجھے لگتا ہے میں اسے دیکھ چکا ہوں۔ ایک کالی کلوٹی چڑیل۔ وہ ہمارے گھر سامان بیچنے آیا کرتی تھی۔"

میں نے سوچا تھا اپنے اس جھوٹ کے ذریعے اس کی خوشنودگی حاصل کرلونگا۔

"اب نہیں آتی؟"

"مجھے ذرا سوچنے دو۔" میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ان عورتوں کو یاد کرنے

لگا جنھیں میں نے اپنے بچپن میں کبھی چچا کے ساتھ دیکھا ہوگا۔ مجھے دور دور تک ایسی کوئی عورت دکھائی نہیں دی۔ تھک کر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور کہا۔ ''نہیں اب نہیں آتی۔''

''تو پھر انھوں نے یہ نام کیوں گدا رکھا ہے؟'' انگورا نے کن انکھیوں سے میری طرف تاکتے ہوئے اپنا سوال جاری رکھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چار سال بڑی تھی اور یہ حیرت کی بات تھی کہ وہ یہ بات مجھ سے پوچھ رہی تھی جب کہ اسے پتہ ہونا چاہئے تھا کہ ایک بار کوئی نام بدن پر گدوا لیا جائے تو پھر اسے مٹایا نہیں جا سکتا، تم ساری زندگی اس کے ساتھ جینے پر مجبور رہتے ہو۔ میں اسے یہ بتانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس نے میری آنکھوں کے اندر تاکتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں پتہ ہے ایک مرد اور عورت کے بیچ میں کیا ہوتا ہے؟''

''وہ جو بھی ہوتا ہوگا اچھا نہیں ہوتا ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عورتیں مردوں سے خوفزدہ رہا کرتیں اور مردوں کے ہاتھوں پٹتے رہنا تو ان کے روز کا مقدر تھا۔ مجھے یاد نہیں ایسا کوئی دن گذرا ہو جب کھیتوں میدانوں میں ہم اس طرح کے تماشے نہ دیکھتے۔

''لیکن جب ابو نے ایک عورت کا نام اپنے بدن پر گدا رکھا ہے تو یقیناً اس میں کوئی تو بات ضرور ہوگی۔'' پھر انگورا نے میرے دونوں بازو سختی سے تھام لیے۔ ''ایک دن تم بھی اپنے بازو پر کسی کا نام گدوا لوگے۔''

''تمھیں یہ خیال کیوں آیا؟'' میں نے اپنے بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

''کیونکہ تم ایک برے لڑکے ہو۔ تم میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔'' اس کی انگلیاں اور بھی سخت ہو گئیں اور اس کے ناخن میری جلد کو کاٹنے لگے۔ میرے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا کہ اس کے سراپے کا جائزہ لوں اور گرچہ وہ مجھ سے

بالکل سٹ کر کھڑی ہونے کے سبب اس کے سراپے کا جائزہ لینا ممکن نہ تھا، مگر اس کے جسم کے لمس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ نہ صرف وقت سے پہلے ہی جوان ہو چکی تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ صحت مند ہونے کے سبب اس کے کپڑے اس کی جوانی سنبھال نہیں پارہے تھے۔

''تم آخر چاہتی کیا ہو؟'' میں نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ آخر وہ میری بہن تھی اور مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میں اس طرح اس کی طرف دیکھوں۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے دیکھا کرو۔'' انگورا بولی۔ اس نے میرے بازو چھوڑ دیے اور اپنے کوارٹر کی طرف چلی گئی جو دوسرے کوارٹروں کے ساتھ ایک مسطح زمین پر کھڑا تھا۔ ان کوارٹروں کی بابا آدم کے زمانے کی چمنیاں اپنی چھتوں پر اگی گھاس پھوس کے درمیان سوالیہ نشان قائم کرتی تھیں۔ یہ چمنیاں بعد میں بننے والے کوارٹروں سے غائب ہوگئی تھیں۔ میں نے ان چمنیوں کی طرف دیکھا جن سے اب بھی کوئلے کے دھوئیں باہر آیا کرتے اور اپنے بازوؤں کو سہلاتے ہوئے کہا، گھبراؤ مت، ایک دن تمھیں تمھارے سوالوں کا جواب ضرور مل جائے گا۔

○ ○ ○

گرچہ ریل ابا کے بازو پر گدی ہوئی یہ پر اسرار آنکھ میں ان دنوں سے دیکھتا آ رہا تھا جب سے میں نے اپنا ہوش سنبھالا تھا، مگر جانے یہ انگورا کی گفتگو کا اثر تھا یا اس کے جوان جسم کا جسے میں نے چھولیا تھا، اس بار ہم لوگ ریل ابا کے یہاں سے واپس لوٹے تو میں نے اپنے آبائی شہر میں اس عورت کی تلاش شروع کر دی جس کے ساتھ میں بچپن سے ریل ابا کے معاشقے کی چہ میگوئیاں سنتا آ رہا تھا۔ ظاہر تھا، میں اس بار گھر لوٹا تو ہر اس پہاڑی عورت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا جو اسٹیشن سے کچھ دور اس ڈھلوان

راستے پر دکھائی پڑ جاتی جس کے کنارے، سنگھاڑوں سے ڈھکے ایک تالاب کے کنارے ہمارا کھپڑ یل کا دو منزلہ مکان واقع تھا۔ یہ زیادہ تر دیہات کی دودھ بیچنے والیاں ہوتیں، یا وہ ٹوکری میں چوڑیاں سجا کر نمودار ہوتیں جو پلاسٹک پر لاکھی جما کر بنائی جاتیں۔ کچھ اپنی ٹوکریوں میں زندہ سانپوں کے ساتھ چمڑے کے گداموں کی طرف جاتی دکھائی دیتیں جدھر سے آتی بدبو دار ہوا کو نتھنوں پر سنبھالنا مشکل کام تھا۔ ایک آدھ تو شہد کے پورے کے پورے چھتے کو سر پر اٹھائے ہوتیں جس میں زندہ مکھیاں کلبلایا کرتیں اور ایک ایسی عورت بھی تھی جو کافی عمر دراز تھی اور جس کے پستان بلاؤز کے نیچے سے نکل کر اس کی ناف تک لٹک آئے تھے۔ وہ اپنی ٹوکری میں اصیل مرغے بھر کر لاتی جو بڑے ہی لڑاکا ثابت ہوتے۔ میرے ایک دور کے رشتے دار، جس کی ایک مودی کی دکان نیل کے ایک متروک کارخانے کے احاطے پر واقع تھی اس سے مرغے خریدا کرتے۔ میرے رشتہ دار مولوی قسم کے آدمی تھے جو ہر وقت پان چبایا کرتے اور آئے دن قیامت کی پیشگوئیاں کیا کرتے۔ مگر ان کے ساتھ یہ عجیب واقعہ تھا کہ وہ بچپن سے لڑاکا مرغوں کے دیوانے تھے۔ وہ ان مرغوں کو لڑنے کی ترغیب دیا کرتے اور انھیں بیچ کر نہ صرف اچھی خاصی قیمت وصولا کرتے بلکہ خود بھی انھیں لے کر گاؤں دیہات کے میلوں ٹھیلوں میں جایا کرتے۔ ہمارے شہر کے باہر چٹانوں پر جہاں ہفتہ وار ہاٹ میں مرغے لڑائے جاتے اور بڈھے شراب پی کر جوا کھیلتے وہاں ان کی موجودگی ایک دائمی چیز تصور کی جاتی۔

”اس عورت کی ایک کہانی ہے۔“ ایک دن اچانک انھوں نے اپنے داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی کے ٹھنٹھ کو تاکتے ہوئے بتایا۔ چار سال قبل ایک لڑاکا مرغے کو سنبھالتے سنبھالتے اس کے پیر سے بندھی منحنی تلوار سے یہ انگلی کٹ کر آدھی رہ گئی تھی۔

”کیسی کہانی؟“

''اس کا شوہر بلا کا شرابی تھا جو ان جنگلی لوگوں میں عام بات ہے۔'' انھوں نے کروشیا سے بنی ٹوپی اٹھا کر اپنا سر کھجاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ان کے بالوں کا رنگ خاکستری تھا جنھیں دیکھتے ہی پھوس کے سڑے گلے چھپر یاد آجاتے جن پر گلہریاں اور چوہے دوڑا کرتے۔ ''اک دن اس نے کھڑے کھڑے اپنی بیوی کو ایک بوتل شراب کے لیے ایک دوسرے آدمی کو بیچ دیا۔''

''ارے نہیں!'' مجھے کہانی سے دلچسپی ہونے لگی۔

''میں جانتا تھا تم یقین نہیں کروگے۔'' میرے رشتے دار نے سر پر ٹوپی واپس رکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ کھیت میں بانس پر کھڑے کسی بجھکاگ کی طرح نظر آرہے تھے۔'' مگر ایسا ہی ہوا تھا۔ تو وہ اس دوسرے آدمی کی وفادار ہوگئی جس نے اسے خریدا تھا۔ اب یہ دوسرا آدمی ایک جادوگر تھا۔ وہ جنگل میں گھومنے والی آتماؤں اور بھوت پریت کو بلانے میں ماہر تھا۔ ان میں سے کئی اس کے حکم کے غلام تھے اور کئی اس کے جانی دشمن جن میں سے ایک نے اس کے داہنے کان میں ایسا مکا مارا تھا کہ اب اس کان سے وہ سن نہیں پاتا تھا۔ ایک دن اس نے اس عورت کو ایک بھیڑ دکھایا جس کی سرخ داڑھی تھی اور کول گول سینگ۔ اس نے اس عورت کو بتایا کہ یہ اس کا پہلا شوہر ہے جسے اس نے جنگل میں بلا کر اپنے بس میں کرلیا ہے۔''

''اور اس عورت نے یقین کرلیا۔''

''ہاں۔ اس کے پاس یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ تو یوں ہوا کہ وہ دن رات اس بھیڑ کا خیال رکھنے لگی، اس کی خدمت کرنے لگی۔ یہ اس کے جادوگر شوہر کو اچھا نہیں لگا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ وہ نہ صرف نکما تھا بلکہ اس عورت سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ اگر اس نے اس بھیڑ کو جان سے مار دیا تو یہ عورت اسے چھوڑ کر جاسکتی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو، یہ آدی باسی عورتیں ہماری عورتوں کی طرح وفادار نہیں ہوتیں کہ مرتے دم تک گھر

کی چوکھٹ سے لگی رہیں۔ چونکہ وہ کافی محنتی ہوتی ہیں اور نہ صرف اپنی خود کی کمائی کرتی ہیں بلکہ اپنے نکمے شرابی شوہروں کا جہنم بھی بھرتی ہیں، وہ ہر وقت نکیل توڑنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ ویسے اس کی ایک دوسری وجہ بھی تھی جس کے سبب جادوگر مجبور تھا''

''دوسری وجہ؟ دوسری وجہ کیا ہو سکتی تھی؟''

''گاؤں والے اس بھیڑ کی بڑی قدر کرنے لگے تھے۔ وہ بھیڑ بلا کا زر تھا جس نے دو سال کے اندر اندر اس پہاڑی گاؤں پر میمنوں کی برسات کر دی۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا جواب دوں۔ آدی باسی عورتوں کے بارے میں میرا علم صفر کے برابر تھا اور بچپن سے میں بھیڑ بکریوں کو صرف بوچڑوں کے ہاتھوں کٹتے دیکھتا آیا تھا۔ ان کا کوئی دوسرا مصرف میری سمجھ سے باہر تھا۔ آخر کار میں نے سر اس طرح ہلایا کہ اس کا کچھ بھی مطلب نکل سکتا تھا۔ میں اس میں کافی مہارت رکھتا تھا۔

مگر اس بار شاید میں چوک گیا تھا۔ میرے رشتے دار کی عقابی آنکھوں نے میری چالاکی کو پکڑ لیا۔

''تم میری بات غور سے نہیں سن رہے ہو۔ تمھیں پتہ ہے مجھے جھوٹ پسند نہیں۔'' اس نے میری طرف ناپسندیدہ نظروں سے تاکتے ہوئے کہا۔

''میں سن رہا ہوں۔''

''نہیں، تمھیں میری بات کا یقین نہیں۔''

''یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟''

''یہ میں تمھاری آنکھوں میں پڑھ سکتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تم ایک بڑے نوٹنکی باز ہو۔ تم جو سوچتے ہو وہ اپنی آنکھوں سے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔''

اور اس نے باقی کی کہانی سنانے سے انکار کر دیا۔ اس دن مجھے پہلی بار پتہ چلا ایک ادھوری کہانی سے زیادہ اذیت ناک چیز اس دنیا میں اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ میں آج بھی اس ادھوری کہانی کی کاٹ لیے گھوم رہا ہوں۔ ساتھ ہی اس واقعے کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں اس آدی باسی عورت کا زیادہ غور سے جائزہ لینے لگا۔ گرچہ اس کا چہرا دوسری آدی باسی عورتوں سے کچھ الگ نہ تھا مگر اس کے پورے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی ناک تھی جس کے دونوں بڑے سوراخوں میں تانبے کے دو کافی بڑے بلاق ڈلے ہوئے تھے۔ گرچہ اس کی قدرے اندر کی طرف دھنسی ہوئی آنکھوں کے اندر ایسا کوئی اسرار نہ تھا کہ آدمی کو کچھ سوچنے پر مجبور کرے، مگر اس کے دونوں پستانوں کی گھنڈیاں اور ان کے گرد پڑے ہوئے تانبے کے رنگ کے حلقے جو ناف کے دونوں طرف پہرا دیا کرتے، کسی سانپ کے پھن کی یاد دلاتے تھے، بلکہ غور سے دیکھنے پر ان حلقوں کے اندر سانپ کے نوکیلے دانتوں جیسا سفید نشان صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ انھیں دیکھتے ہوئے مجھے ایسا لگتا جیسے کوئی زہریلا سانپ میری پشت پر رینگ رہا ہو۔ جانے کیوں مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا کہ میں انکی طرف تاکتے ہوئے ایک عظیم گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

اس عورت کو شاید میری دلچسپی کا پتہ چل گیا تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا، وہ ہمارے گھر کے باہر بجلی کے کھمبا کے نیچے رک گئی تھی اور میری طرف عجیب نظروں سے تاک رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی نظروں کو سمجھ پاتا، اچانک اس نے اپنا بایاں بازو میری طرف کر دیا جو اس کی بغل تک ننگا تھا۔

اس پر ایک بھیڑ کی تصویر گدی ہوئی تھی جس کی داڑھی تھی اور گول گول سینگ!

○ ○ ○

اس واقعے کے بعد بھی میں نے اس جنگلی عورت کو کئی بار دیکھا۔ میری خواہش ہوئی کہ اس سے اس آدمی کا پتہ پوچھوں جو لوگوں کے جسم پر گودنے کا کام کرتا ہے۔ مگر مجھے لگا، میں یہ اسے کبھی سمجھا نہ پاؤں گا۔

دھیرے دھیرے میں اسے بھول گیا۔ اس بار میں نے ریل ابا کے گھر جانے کی ٹرین پکڑی تو نہ صرف اکیلا تھا بلکہ میں بہت حد تک بدل چکا تھا۔

اپنا سوٹ کیس اٹھائے میں ریل ابا کے کوارٹر کے اندر داخل ہوا تو میں نے جھجکتے ہوئے انگورا کی طرف دیکھا جو دوسرے کمرے میں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ اس دوران کچھ اور موٹی ہوگئی تھی اور میری طرف نہیں تاک رہی تھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مجھے لگا اس کی آنکھوں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ یقیناً اسی دوران اس کے ساتھ کچھ ایسا ہوا تھا کہ میں اس کے لیے بے معنی ہو چکا تھا۔ مجھے اس کا بہت دکھ ہوا۔ میں بڑی امیدوں کے ساتھ آیا تھا۔ ان کچھ مہینوں میں میں نے بہت ساری نئی اور ممنوعہ باتیں جان لی تھیں اور اسے حیران کر دینا چاہتا تھا۔ مگر یہاں تو سارے دروازے بند پڑے تھے۔ اس پر صرف انگورا کے اندر کی غیر متوقع تبدیلی میرے لیے ایک مسئلہ نہیں تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ مایوس کن ایک اور واقعہ میرا منتظر تھا۔

وہ ریلوے کا کنواں جس میں سانپ کلبلاتے تھے، جو اب میرے خوابوں میں بھی آنے لگا تھا، ویران پڑا تھا۔ اس کے پیندے میں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے سر اندر لے جا کر اپنی آنکھوں کو حتی المقدور بڑی کر کے دیکھا، اس کے سارے سانپ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

"یہ کوئی کنواں نہیں ہے برخوردار، بلکہ لوہے کا ایک بڑا ٹینک ہے جو زمین میں اندر تک گڑا ہوا ہے۔" گھر لوٹنے پر ریل ابا نے مجھے بتایا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نشے میں تھے اور اپنا سامان لکڑی کے ایک بکس کے اندر رکھ رہے تھے جس کا نیلا رنگ کب کا اڑ

چکا تھا۔سورج ڈوبتے ہی وہ اپنی ٹرین لے کر اڑیسہ کے پہاڑوں کی طرف جانے والے تھے۔" وہ آخری اسٹیم انجن جو ادھر چلا کرتا تھا، اب ہٹا لیا گیا ہے۔ اسے تم اسٹیشن کے باہر دیکھ سکتے ہو جہاں اسے لوگوں کی نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ظاہر ہے اب اس ٹینک کا کوئی مصرف نہیں رہا۔اس کنواں میں ویسے بھی پانی بہت کم ہو گیا تھا اور گزشتہ کئی برسوں سے بارش لگاتار کم ہونے کے سبب اب تو وہ تالاب بھی سوکھ چکا ہے جس کا پانی پائپ کے ذریعے اس کے اندر لایا جاتا تھا۔"

"اور اس کے سانپ؟"

"یہاں کی جان لیوا گرمی کا تو تمھیں پتہ ہے۔ پیندا سوکھ جانے کے سبب ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا۔جو زندہ بچے انھیں چیل اور پہاڑی کوے اٹھا کر لے گئے۔تم ایک مہینہ پہلے تک ان میں سے کئی کو پیندے میں کلبلاتے دیکھ سکتے تھے اور ان مارخوروں کو بھی جو کنویں پر منڈلایا کرتے اور موقع ملتے ہی اندر غوطہ لگا کر کسی ادھ مرے سانپ کو پنجوں میں دبا کر نکل آتے۔"

یہ گویا انگورا کی طرح کا ہی واقعہ تھا۔صرف میرے پنجے میں وہ آنے سے رہ گئی تھی۔

انگورا کے سلسلے میں میرا اندازہ غلط ثابت نہ ہوا۔بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ وہ ایک لڑکے سے ریل کی پٹریوں سے کچھ دور سال کے ایک جنگل کے باہر ملا کرتی ہے۔جہاں کھیت کی منڈیروں پر کاش کے پھولوں کے قدِ آدم پودے لہلہایا کرتے۔ وہ لڑکا ملٹری چھاؤنی سے خریدی گئی اپنی سرخ رنگ کی بلٹ موٹر سائکل پر آتا اور دونوں سگنل مین کے ایک کنڈم گھر کے برامدے پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ایک بار انھوں نے مجھے دیکھ بھی لیا مگر اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے میں ان کے لیے کوئی خاص واقعہ نہ تھا۔

"وہ لڑکا تمھیں پسند ہے؟" دوسرے دن اکیلا پا کر میں نے انگورا سے دریافت کیا۔

''کیا تم اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ یہ سوال کر سکو؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب میں اس دنیا کو زیادہ جان گیا ہوں۔ تمھیں پتہ ہے تمھارے باپ کی ایک دوسری عورت بھی تھی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے لا پرواہی سے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''اب وہ میری ماں کے علاوہ کسی کے پاس نہیں جاتے۔''

''تم یہ یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو۔ ریل ابا تو زیادہ تر اپنے انجن کے ساتھ باہر رہا کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب وہ پہلوانی نہیں کرتے، مگر اب بھی ایک ہٹے کٹے انسان ہیں۔ جب کہ تمھاری ماں بوڑھی ہو چکی ہے۔''

''اپنی چاچی کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتے تمھیں شرم نہیں آتی۔ اور تم کیا چاہتے ہو کہ میں اس دوسری عورت کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنی صحت خراب کرلوں۔'' اس نے بپھر کر کہا۔

''میں تمھاری جگہ ہوتا تو اس عورت کو ڈھونڈ نکالتا۔''

''پھر اس کا کیا کرتے؟''

''انگورا، تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہاں کچھ کرنے کرانے کی بات کہاں سے آ گئی؟ یہ تو ایک اولاد کے لیے فطری بات ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ویسے اب تم نے پوچھ لیا ہے تو میں بتا دوں میں اس لڑکے کے ساتھ بھاگنے والی ہوں۔''

''ریل ابا کو بتا کیوں نہیں دیتیں۔ شاید وہ تم دونوں کی شادی کرا دیں۔''

''وہ ایسا کبھی نہیں کرینگے۔'' انگورا نے میری آنکھوں کے اندر تاکتے ہوئے کہا جیسے مجھے اندر سے ٹٹول کر دیکھ رہی ہو کہ میں بھروسے کے لائق ہوں کہ نہیں۔ ''اس پر کئی خون کے الزام ہیں۔ پولس ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتی ہے۔''

''اور اس کے باوجود تم اس سے ملتی رہتی ہو۔''

''میں ملتی تو ہوں۔ اور یاد رکھو میں ایک ایسے باپ کی بیٹی ہوں جس کے بازو پر اس کی رکھیل کا نام گدا ہوا ہے۔''

ہمیں انگورا کی ماں برقع میں دکھائی دی۔ وہ اپنی منجھلی بیٹی کے ساتھ ریلوے مارکیٹ سے کچھ سامان خرید کر رکشا پر گھر لوٹ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے کاش کے لہراتے پھولوں کے اوپر صرف رکشے کا ہُڈ رہ گیا جو زمین ناہموار ہونے کے سبب بری طرح ڈگمگا رہا تھا۔ ہُڈ کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی انگورا نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''تمھیں اس کنویں کے لیے دکھ ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور مجھے اس کا بھی دکھ ہے کہ دھواں اگلتا وہ انجن اب محض ایک نمائش کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ میرا سارا بچپن اس اسٹیم انجن کو پینٹ کرتے گذرا ہے۔ میں ریل کی پٹریوں پر ہمیشہ دھواں اگلتے اس انجن کو تلاش کروں گا۔''

''اور کوئی دکھ؟''

''مجھے تمھارے لیے دکھ ہے۔ میں ابھی سے دیکھ رہا ہوں کہ ایک دن تم اس موٹر سائکل پر بیٹھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جانے والی ہو۔''

وہ اپنے چمکدار دانتوں سے ہنس پڑی۔ ''سب ٹھیک کہتے ہیں کہ تم ایک بڑے نوٹنکی باز ہو۔''

○ ○ ○

اس کے بعد ہم کئی بار وہاں گئے، مگر آخری بار وہاں سے واپس لوٹنے کے بعد جانے کیا ہوا کہ ابا نے ریل ابا کے پاس جانا بند کر دیا۔ اسکول کی چھٹیوں پر میں جب

بھی اس کا ذکر کرتا تو وہ خاموشی سے ٹال جاتے اور اس طرح دو سال کا عرصہ گذر گیا جب ایک دن ہمیں انگورا پر جن کے سوار ہونے کی اطلاع ملی۔ تب تک عاملوں اور فقیروں کے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے سبب اس پر سے سایہ اتر چکا تھا۔ یوں یہ اطلاع ہمیں بہت دیر سے ملی تھی مگر یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ رشتے داری کی خاطر ابا وہاں جانے پر مجبور ہو گئے۔

میں انگورا کو ایک لمبے عرصے کے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی لانبی ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور وہ زیادہ تر وقت بغیر ملے ڈولے چار پائی پر بیٹھی باہر صحن کی طرف تاکتی رہتی جو کوئلوں کے ڈھیر کے سبب سیاہ ہو رہا تھا۔ یہ کوئلے ٹرین سے کوئلہ چرانے والے مفت گھر پہنچا جاتے۔

''تمھیں جلد سے جلد انگورا کی شادی کر دینی چاہیے۔'' ابا نے ریل ابا کو مشورہ دیا۔ ''اور تم اس عورت کا پیچھا چھوڑو۔ میں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں۔ تمھاری لڑکیاں اب بڑی ہو چکی ہیں۔ میں نے سنا ہے اس سے تمھارا ایک لڑکا بھی ہے۔''

''قسم ہے معبود پاک کی جو میں نے پچھلے دس برس سے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ اور اس لڑکے کی پیدائش کا واقعہ تو سراسر افواہ ہے۔''

ابا کو معلوم تھا وہ جھوٹ کہہ رہے تھے۔ مگر ابا صرف اسی حد تک جانے کے عادی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا میں اچھا بننے کا پہلا حق اسی انسان کو ہے جو برا ہے۔ میں انگورا کے سامنے بیٹھا اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ماں زمین پر بیٹھی ایک سڑے گلے لحاف کو کھول رہی تھی جس کے روؤں میں گُتھے پڑ گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح وہ ایک ایسی عورت نظر آ رہی تھی جس کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔

''تم پر کوئی جن کیسے سوار ہو سکتا ہے؟'' میں نے انگورا سے پوچھا۔ ''بات کیا ہے؟''

''تم جنات کا مذاق نہ اڑایا کرو۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے اس کی کسی دکھتی

رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔" وہ ہمارے آس پاس ہی گھومتے رہتے ہیں، کبھی کبھی جاندار کی شکل میں کبھی جانور کی شکل میں۔ تم مسلمان ہو کہ نہیں۔ ان کے سلسلے میں اپنا رویہ درست کرلو۔"

"تم انھیں دیکھ سکتی ہو؟" میں اس کی فصیح گفتگو سے حیران تھا۔ کیا واقعی کسی آسیب نے اس پر سایہ کر رکھا تھا؟ کیا اس نے یہ سب کچھ اسی سے سیکھا تھا؟ انگورا ایک ٹک میری آنکھوں کے اندر دیکھا کی۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" اس نے جھکی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔ پھر اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ماں، تم اسے سمجھاتی کیوں نہیں؟"

"آپ انگورا کو باہر کہیں ٹہلانے کیوں نہیں لے جاتے میاں۔" چاچی نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ وہ روئی کے گٹھوں سے نکل نکل کر تیزی سے بھاگتے کھٹملوں کو سمنٹ کے فرش پر مسلتی جا رہی تھی۔ "اس نے تو گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"میں کہیں نہیں جانے والی۔" انگورا بولی اور چپ ہو رہی۔ میں انتظار کرتا رہا اور اس کی ماں اپنا کام ختم کر کے جیسے ہی سامان سمیٹ کر دوسرے کمرے کی طرف گئی میں نے سرگوشی میں اس لڑکے کا ذکر کیا جس سے وہ سگنل مین کے کوارٹر میں ملا کرتی تھی۔

"وہ پچھلے نو مہینے سے غائب ہے۔" انگورا نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "میں نے سنا ہے اس کا خون ہو چکا ہے۔ مگر یہ واقعہ جھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔ تم میرے لیے صحیح خبر لا سکتے ہو؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ واقعات ہمیشہ ایسے ہی اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔" میں نے کافی خود اعتمادی کے ساتھ فیصلہ سنایا اور کوارٹر کے پیچھے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ یہاں کوارٹروں کے درمیان کوئی راستہ نہ تھا صرف کھلی جگہیں تھیں جہاں جگہ جگہ کوڑوں کا انبار تھا یا کنکریٹ کے ٹوٹے پھوٹے نالے جن کا غلیظ پانی نالے کے

خاتموں پر ملک کے نقشوں کی طرح رکا پڑا تھا۔ ان کوڑوں کے ڈھیر اور غلیظ نالوں کو پھلانگتے ہوئے میں ان کے حصار سے باہر نکل آیا اور ایک کچے راستے پر چلنے لگا جو بتدریج نیچے ہوتے ہوئے نشیب میں جا کر ایک لیول کراسنگ سے گذر کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ پٹریوں کے کنارے کنارے میرا رخ اس جنگل کی طرف تھا جس کے باہر کھیت کی منڈیروں پر کاش کے سفید پھول لہلہایا کرتے۔ مگر یہ کاش کے پھولوں کا موسم نہیں تھا۔ کھیت ننگے پڑے تھے۔ آسمان پرندوں سے خالی تھا۔ راستے میں جو پیڑ آ رہے تھے ان کے پتوں پر زرد و سرخ رنگ چڑھنے لگے تھے۔ ہوا کے جھونکوں کے سبب شاخوں سے تیزی سے پتے جھڑ رہے تھے۔ پت جھڑ کی مار جھیلتے ان درختوں سے میں بہت دور نکل آیا تھا اور ایک جگہ جہاں کنکریٹ کے ایک چبوترے کے نیچے پانی بہہ رہا تھا، کھڑا پتھر کے ٹکڑوں کے اوپر بچھی ریل کی پٹریوں کی طرف تاک رہا تھا جس سے تھوڑی دوری پر سگنل مین کا متروک کوارٹر تھا۔ میں نے دیکھا، اس کی کھڑکیاں اور دروازے نکال لیے گئے تھے اور اس کی ڈھلواں چھت کے اندر ایک بڑا سا سوراخ بن گیا تھا جس سے سفید آسمان نظر آ رہا تھا۔ اس کوارٹر کی طرف تاکتے ہوئے جانے کیوں مجھے اس کا یقین ہو گیا کہ انگورا ضرور میرے پیچھے پیچھے اس جگہ آ گئی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ پانچ منٹ سے زیادہ نہ گذرے ہوں گے جب مجھے انگورا دکھائی دی۔ وہ مجھ سے بیس ہاتھ کے فاصلے پر رک گئی تھی جیسے نئے سرے سے میرے بارے میں سوچ رہی ہو۔ اس کے پیر ٹخنوں تک گھاس کے اندر چھپے ہوئے تھے۔

''تم اس طرح دور کھڑی میری طرف کیوں تاک رہی ہو؟'' میں نے اپنی آواز تھوڑی سی اونچی کر کے اس سے دریافت کیا۔

وہ برامدے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے داہنے پیر کی ہوائی چپل اتار کر پیر کے تلوے کو برامدے کے زینے پر رگڑنے لگی۔ شاید اس نے کسی غلیظ چیز کے اندر

پاؤں ڈال دیا تھا۔

''تم اس جگہ کیوں آئے ہو؟'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر دریافت کیا۔

''مجھے یہ جگہ پسند ہے۔'' میں نے جھوٹ کہا۔''یا شاید میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم دونوں کی ملاقات کے خاتمے کے بعد یہ جگہ کیسی لگ رہی ہوگی۔''

''کمینے! میں اچھی طرح جانتی ہوں تمھارے دماغ میں کیا ہے۔تم میرے ساتھ آؤ!'' اس نے ہوائی چپل واپس پہن کر کوارٹر کے عقب میں نصف فرلانگ دور واقع جنگل کی طرف اشارا کیا اور کھیت کی منڈیروں پر احتیاط کے ساتھ چلتے ہوئے جنگل کی طرف چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا یا شاید منڈیریں اتنی پتلی تھیں کہ ان پر چلتے ہوئے مڑ کر پیچھے دیکھنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اس کے سڈول کولھوں کو جمپر پر خطوط بناتے دیکھتے ہوئے پہلی بار کسی جوان لڑکی کی قربت کے احساس سے میرے بدن میں چینٹیاں رینگ رہی تھیں۔

○ ○ ○

پیڑ کے تنوں کے درمیان ناہموار زمین پر اگی جھاڑیوں سے بچتے ہوئے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پیڑوں کے درمیان کا فاصلہ دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا تھا۔ جہاں جڑیں زمین سے باہر نکل آئی تھیں وہاں کی زمین پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ مجھے بہت زیادہ اندر جانا نہیں پڑا۔ شاخوں سے اترتی دھوپ کے نیزوں کے درمیان میں نے انگورا کو دیکھ لیا۔ وہ ساگوان کے ایک پیڑ کے تنے سے کان لگائے کھڑی تھی۔ یہ پیڑ بہت پرانا نہیں تھا۔ اس کے پتے کافی چکنے اور چمکدار تھے۔ اس کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ انگورا کو میری موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ آخر کار مجھے پہل کرنی پڑی۔

"تم یہ کیا کر رہی ہو؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میرے خدا۔ میں ان آنکھوں کو زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ وہ انگورا کی آنکھیں یقیناً نہیں تھیں۔ وہ ایک ایسی لڑکی کی آنکھیں تھیں جسے میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

"تم میری طرح کسی پیڑ سے کان لگا کر سنتے کیوں نہیں؟" انگورا نے اپنی انگلی سے میری داہنی جانب کے پیڑ کے تنے کی طرف اشارا کیا جس پر دیمک کی مٹی کی لہردار لکیریں کسی حالیہ بارش کے سبب پگھل کر دھندلی پڑ گئی تھیں۔ میں نے مڑ کر انگورا پر نظر ڈالی۔ وہ ایک بار پھر اپنا کان پیڑ کے تنے سے لگائے آنکھیں بند کئے کھڑی تھی۔ میرا پیڑ کافی بوڑھا اور نیم مردہ تھا۔ اس کے کھردرے اور گانٹھ دار تنے پر سرخ و سفید چیونٹیاں چل رہی تھیں۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے ایک جگہ کو صاف کیا اور اپنا بایاں کان احتیاط کے ساتھ اس جگہ ٹکا دیا۔ مجھے سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے جو پیڑ کی پھننگوں سے بہہ کر نیچے کی طرف آ رہی تھی اور جس میں چڑیوں کی بالکل دھیمی چہچہاہٹ شامل تھی کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔

"ایسے نہیں بیوقوف۔" انگورا کی آواز آئی۔ "اپنا کان اچھی طرح تنا پر دباؤ۔ تمھیں تو کوئی کام صحیح ڈھنگ سے کرنا بھی نہیں آتا۔"

میں نے اپنا کان پوری طاقت کے ساتھ تنا پر دبا دیا۔ درخت کی مردہ چھال کی چبھن ناقابل برداشت تھی، مگر میں خود کو زیادہ بیوقوف بنتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اور تب وہ عجیب واقعہ ہوا۔ مجھے دھیرے دھیرے کچھ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے تو بہت ہی مدھم، کبھی کبھار بالکل غائب ہوتی ہوئی اور پھر بتدریج تیز ہوتی ہوئی آوازیں جو تنے کے اندر سے آ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین کے اندر ہزاروں عورتیں بچے کافی چلا چلا کر باتیں کر رہے ہوں، ایک دوسرے کو پکار رہے ہوں۔ میں نے ڈر کر

اپنا کان ہٹا لیا۔

''تمھیں آوازیں سنائی دیں؟'' انگورا میرے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

''یہ سب کیا ہے انگورا؟ یہ آوازیں کیسی تھیں؟''

''ابھی تم نے پورا سنا کہاں ہے۔'' اور اس نے میرے پیڑ کے تنے سے اپنا دوسرا کان لگا دیا۔ میں نے دوبارا اس کی تقلید کی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اب وہ آوازیں، صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں اپنی حیرت زدہ آنکھوں سے انگورا کی بند آنکھوں کی طرف تاک رہا تھا۔

''انگورا، کیا یہ واقعی انسانی آوازیں ہیں یا ہمارا وہم ہے؟''

''تم ہی بتاؤ۔ تمھیں تو سایوں پر یقین نہیں ہے نا؟'' انگورا نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔

''نہیں، مجھے پتہ ہے یہ کوئی جنات ونات کا چکر نہیں۔'' میں نے اس پیڑ سے الگ ہٹ کر ایک دوسرے پیڑ کے تنے سے کان لگاتے ہوئے کہا۔ اس پیڑ سے بھی وہی آوازیں آ رہی تھیں اور اب یہ آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن یہ آوازیں اب بدل گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سینکڑوں ہزاروں عورتیں اور بچے سینہ پیٹ رہے ہوں، بین کر رہے ہوں۔ نوحہ و ماتم کی ان آوازوں کو سننے کے لیے اب کوئی کوشش نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔ انھیں میرے کانوں کا راستہ مل گیا تھا۔

''زمین کا ماتم۔۔۔'' انگورا کی آواز آئی۔ ''ان انسانی آوازوں کو تم اور کیا کہو گے جو زمین کے اندر سے آ رہی ہیں۔''

''میں نہیں جانتا۔'' میرا سینہ کانپ رہا تھا۔ انگورا کی موجودگی کے باوجود یا شاید اسی کے سبب جنگل کی تنہائی کا احساس میرے اندر اور گہرا ہو گیا تھا۔ نہ صرف میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے بلکہ مجھے زمین پر پاؤں رکھتے ہول آ رہا تھا۔ ہر قدم پر مجھے

ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی کچھ انسانی ہاتھ زمین کے اندر سے نکل کر میرے پیر تھام لیں گے۔

''اب بتاؤ، تم انھیں کیا کہو گے۔'' انگورا میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ میں اس کی سانسوں کی گرمی اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا۔ میں اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے یکے بعد دیگرے تنوں سے کان لگاتا جا رہا تھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آخر یہ سب کیا ہے۔'' آخر کار میں ایک جگہ تھم کر انگورا کی طرف تاکنے لگا۔ میرے پیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ہر طرف سے یہ دہشتناک آوازیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ میں وہاں سے فوراً چلا جانا چاہتا تھا۔

''کیا تمھیں نہیں لگتا جس زمین پر تم کھڑے ہو اس کے نیچے سینکڑوں عورتیں بچے ماتم کر رہے ہیں، سینہ پیٹ رہے ہیں۔ یہ بین، یہ سینہ کوبی، تم ان کے بارے میں کیا کہو گے۔ یہاں کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟''

واقعی یہ عجیب تھا۔ زمین کے اندر سے آتیں عورتوں بچوں کی بین کی آوازیں!

''تمھیں یہ آوازیں سنائی دے رہی ہیں نا؟''

''ہاں'' میں نے کہا کیونکہ اب میں ان آوازوں کو تنوں سے کان لگائے بغیر بھی سن رہا تھا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے انگورا۔ تم یہاں اکیلے کیسے آیا کرتی ہو۔ چلو یہاں سے۔ یہ جگہ ہم انسانوں کے لیے نہیں ہے۔''

''کیا سچ مچ؟ اور تمھیں کس چیز کا ڈر ہے؟'' انگورا کی ہنسی بہت ہی دہشتناک ہو چلی تھی۔ ''اور اس زمین سے بھاگ کر کہاں جائینگے ہم لوگ۔ یہ زمین ہی تو ہمارا مقدر ہے نا؟ شروع سے آج تک راربوں کھربوں لوگ مٹی بن کر اس میں مل چکے ہیں۔ ہم ان سے کہاں تک پیچھا چھڑا سکینگے۔ ایک دن انھیں کے بیچ تو ہمیں بھی اترنا ہے۔ یہ ماتم کرتے لوگ، کیا یہ کبھی ہماری تمھاری طرح اس زمین پر نہیں چلے ہونگے؟''

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ یہاں سے چلو بھی۔" اس وقت مجھے اس جنگل سے زیادہ پر اسرار وہ خود نظر آ رہی تھی۔۔ میرے سامنے کا سارا منظر دھندلا ہو چلا تھا۔ درخت کے پتوں سے کٹ کٹ کر گرتی دھوپ کے سبب ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا جنگل پانی کے اندر تیر رہا ہو۔ جھاڑیوں، گڈھوں اور زمین سے نکلی ہوئی جڑوں کے بیچ اپنے ڈگمگاتے قدموں سے میں جنگل سے باہر کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جگہ جگہ میرے پیر پتوں میں دھنس رہے تھے جن کا احساس مجھے دھنس جانے کے بعد ہو رہا تھا۔ مجھے چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا وہ میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ مگر تھوڑی دور جا کر میں نے محسوس کیا وہ میرے پیچھے نہیں تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دھندلی روشنی میں تیرتے تنوں کے بیچ پہلے تو وہ نظر نہیں آئی، پھر ایک جگہ دکھائی دے گئی۔ ایک پیر زمین پر ٹکائے دوسرا ایک پیڑ کے تنے پر رکھ کر وہ ایک درخت سے لگ کر کھڑی تھی اور پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف تاک رہی تھی۔ "ڈرپوک!" اس نے چلا کر کہا۔ "تم تو کسی کام کے نہیں۔"

وہ تنوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

○ ○ ○

میں اس آوازوں والے جنگل سے باہر نکل آیا ہوں اور اب ایک راکھ سے ڈھکے آسمان کے نیچے چل رہا ہوں۔ میں سگنل مین کے کوارٹر کی طرف نہیں جا تا نہ ہی میرا رخ رہائشی کوارٹروں کی طرف ہے جن کی چمنیاں مجھے رہ رہ کر دکھائی دے جاتی ہیں۔ میں پٹریوں کو پھلانگ کر دوسری طرف کی نشیبی زمین پر چڑھنے لگتا ہوں۔ اوپر آ کر میں دیکھتا ہوں، اس طرف کی زمین زینے کی شکل میں اونچی ہوتی چلی گئی ہے جن پر گھاس اور جھاڑیوں کا جنگل اگ رہا ہے۔ ایک آدھ جگہ مڑے تڑے تنوں والے پیڑ

نیلے آسمان کے نیچے اس طرح کھڑے ہیں جیسے تیز ہواؤں نے انھیں اینٹھ کر چھوڑ دیا ہو۔ ان درختوں پر بس تھوڑے سے ہی پتے بچے ہیں جو ہوا میں بہت ہی خطرناک ڈھنگ سے لرز رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں جیسے آخری سانس لے رہے ہوں۔ اس بتدریج اونچی ہوتی ہوئی زمین پر چڑھتے چڑھتے جو کہیں کہیں خطرناک حد تک تنگ ہو گئی تھی ، مجھے اسٹیشن کا لوہے کا پل دکھائی دے گیا اور میں اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ میں نے پلٹ کر دور چمکتی پٹریوں سے پرے ننگے کھیتوں کے بیچ اس پر اسرار جنگل کی طرف دیکھا جہاں میں انگورا کو چھوڑ آیا تھا۔ یہاں سے جنگل کے پیڑ کافی اونچے اور گھنے لگ رہے تھے۔ ان کی پھننگوں میں ذرا سی بھی ہلچل نہیں تھی مگر اتنی دوری کے باوجود وہاں سے رہ رہ کر کسی پہاڑی کوے کی پکار سنائی دے جاتی تھی۔ میں ان پہاڑی کوؤں کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ عام کوؤں کی طرح کبھی مل کر نہیں چلاتے۔

میں لوہے کے کنویں کی طرف چل پڑتا ہوں۔

کنواں ہمیشہ کی طرح آج بھی ویران پڑا ہے۔ میں اس کی منڈیر کو تھام کر اندر جھانکتا ہوں۔ پانی غائب ہو جانے کے سبب کنواں کافی گہرا اور تاریک نظر آ رہا ہے۔ پیندے کی طرف تاکتے تاکتے مجھے وہاں تھوڑا بہت پانی کا نشان دکھائی دینے لگتا ہے جو شاید کسی حالیہ بارش کا نتیجہ ہو۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ یہ واقعی پانی تھا یا اندر تیرگی نے پانی کی شکل اختیار کر لی تھی کہ مجھے اس سیاہ روشنائی جیسی چیز میں ایک سلوٹ سی جاگتی نظر آئی۔ کوئی چیز وہاں کلبلا رہی تھی۔ ہاں، میں نے اندھیرے سے مانوس ہوتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا ایک بہت ہی چھوٹے جسم کا سانپ پیندے کے پایاب پانی میں بے چینی سے رینگ رہا تھا۔ میں سر بہت اندر تک ڈالے ہوئے پانی کی بار بار معدوم ہوتی سطح پر اس تاریک لکیر کو بنتے اور اور مٹتے دیکھ رہا تھا جب مجھے کانوں کو چیر جانے والی ایک سیٹی سنائی دی۔

میں نے چہرا آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھا۔
ایک چیل اپنے کیم شحیم پر پھیلائے کافی نیچے اتر آئی تھی اور اس کنویں کو مرکز بنا کر آسمان میں تیزی سے چکر لگا رہی تھی۔

○ ○ ○

نادر سکّوں کا بکس

میں ایک لمبے عرصے سے اسکی تلاش میں تھا۔ میں اپنا زیادہ وقت ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ تک پیدل طے کرنے میں بتاتا۔ میرے کچھ دوست لانچ پر سوار جس کی چمنی سے دھواں نکل نکل کر ہوا میں منتشر ہوتا رہتا ہمیشہ دوسرے کنارے کی طرف جارہے ہوتے۔ میں انھیں دور سے ہاتھ ہلا کر الوداع کہتا اور وہ بینچ پر بیٹھے یا لوہے کے ریلنگ کے سامنے کھڑے میری طرف مایوسی سے تاکتے رہتے۔ انھیں اس بات کی فکر تھی کہ میں کبھی دوسرے کنارے پہنچ نہ پاؤں گا۔ ان کی سوچ کچھ غلط بھی نہ تھی۔ ابھی حال میں ہی میں نے ایک بے تکا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں نے ایک مرتے ہوئے بوڑھے کو، جس کا اس سیارے پر کہیں ٹھکانہ نہ تھا، اسپتال پہنچا کر اس کے باقی کے دنوں میں چند بیکار اضافے کئے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی، میں خود کو سمجھاتا، کہ بوڑھے نے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میں تھک کر بس اسٹاپ کے سائبان کے نیچے لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کے پائے کنکریٹ کی زمین میں پیوست تھے اور اپنی ناک کی سیدھ پر تاکنے لگا۔ سامنے کی روشن پٹریوں پر جیسے ایک ہی ٹرام بار بار گذر رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس سے دلچسپی بھی ہو جاتی۔ مگر وہ ہر بار گھنٹی بجا کر جا چکی ہوتی اور میں اس کی پشت سے لٹکتی رسّی کے سوا کچھ نہ دیکھ پاتا۔

''اسے جب میں نے سوچا ہے، تو ایک دن اسے میرے رو برو آنا ہی ہے۔ اور جب وہ نمودار ہوگا میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔ میں اسے اپنے نادر سکّوں کا بکس تحفے کے طور پر دے دونگا۔''

یہ نادر سکّوں کا بکس، اگر آپ کو اس سے دلچسپی ہو، تو بتا دوں اسے میرے چھوٹے چاچا نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کے ہو چکے تھے مگر انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کا کمرا پرانی کتابوں کا پیوں، بند گھڑیوں، کمپاس، قطب نما، قدیم نقشوں جو اپنی موڑنے والی جگہوں سے ٹوٹنے لگے تھے اور دوسرے الم غلم سامانوں سے اٹا پڑا تھا۔ گھر کے افراد ان کے کمرے میں جانے سے ڈرتے تھے۔ مجھے آج تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ یہ بکس انھوں نے مجھے کیوں دیا۔ وہ میری سالگرہ کا دن تھا نہ کوئی تہوار کا موقع، نہ ہی میں نے اسکول یا کھیل کے میدان میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ صرف کنجی میرے ہاتھ میں تھماتے وقت انھوں نے آنکھ ماری تھی۔

''یاد رکھنا، اس سے زیادہ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

یہ ان کے پاگل پن کی شروعات تھی۔

اب ان کو پاگل ہوئے دو سال بیت گئے تھے۔ اسی درمیان میں نے وہ بکس کبھی کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ابھرے ہوئے ڈھکن پر لاکھ کا گہرا اوارنش چڑھایا گیا تھا جس میں لانبی چونچ والے متنوع پرندوں کی رنگین تصویریں تھیں۔ بکس کی بیرونی دیواروں پر خوشنما پتّوں والی بیلیں ابھاری گئی تھیں۔ صرف پیندا کسی بھی طرح کے رنگ و روغن سے عاری تھا۔ بکس کو ہلانے پر اندر سے سکّوں کے کھنکنے کی آواز سنائی دیتی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بکس کے رنگ و روغن پر گذرتے وقت کا ذرا سا بھی نشان نہیں پڑا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی شامل کر دوں کہ میں دو سال کے اندر اندر اسے الماری کے اندرونی حصے میں کپڑوں کی تہہ میں رکھ کر پوری طرح بھول گیا تھا۔ پھر

جب ہم لوگ ایک ڈیزل ٹرین میں بیٹھ کر اس پہاڑی شہر کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے پاگل خانے میں وہ رکھے گئے تھے، تو مجھے اس کا خیال آیا اور میں نے نادر سکّوں کا بکس اپنے سوٹ کیس کے اندر ڈال لیا۔

پاگل خانے کے لان میں جہاں ملاقاتیوں کو پاگلوں سے ملنے کی اجازت تھی، ان کی غیر فطری طور پر بڑھی ہوئی شیو اور گندے لباس کے باوجود ان کے لانبے قد اور تیز عقابی آنکھوں کے سبب مجھے چچا کو پہچاننے میں دشواری نہ ہوئی۔ اور جب کہ لوہے کے بند پھاٹک کے پیچھے کھڑے دوسرے پاگل شور مچا رہے تھے یا رو رہے تھے یا ہنس رہے تھے (اگر یہ ان کی اداکاری نہ تھی) وہ ملاقاتیوں کے شیڈ کے اونچے برامدے پر ہمارے برابر بیٹھ گئے اور میرے ابا سے باتیں کرنے لگے۔ بات کرتے کرتے انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا دی اور دیر تک نادر سکّوں کے بکس کی طرف تاکتے اور مسکراتے رہے۔

ابا سے بات ختم کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

''اور سب کی طرح تم بھی تو مجھے پاگل نہیں سمجھتے ہو نا؟'' انھوں نے میرا داہنا کان اینٹھتے ہوئے کہا جسے ابا نے سن لیا۔ وہ زیرِ لب مسکرائے مگر خاموش رہے۔

''نہیں'' میں نے کہا۔ پاگل خانے کے دو ملازم حفظِ ما تقدم کے طور پر ہمارے سر پر تعینات تھے۔

''لگتا ہے تم بھی پاگل ہو گئے ہو۔'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔'' اگر میں پاگل نہیں تو کیا میں یہاں بھاڑ جھونکنے کے لیے رکھا گیا ہوں۔ اور یہ بکس، اسے تم نے کبھی کھولنے کی کوشش نہیں کی۔''

''یہ آپ کو کیسے پتہ؟''

''کیونکہ میں نے تمھیں غلط کنجی دی تھی۔ اب بتاؤ میں پاگل ہوں؟''

ابا نے مجھے اٹھنے کا اشارا کیا، مگر اس سے پہلے ہی چاچا میرا داہنا ہاتھ سختی سے تھام چکے تھے۔

''تم پڑھائی میں دھیان نہیں لگاتے اور غلط سلط چیزیں سوچتے رہتے ہو۔''

''چاچو، میرا ہاتھ دکھ رہا ہے۔''

''تم صرف میرے بارے میں سوچتے رہتے ہو۔''

مجھے لگا میری کلائی کی ہڈی ٹوٹ جائےگی اور میں چیخ پڑا۔

انھیں دونوں ملازم نے بہت مشکل سے مجھ سے الگ کیا۔ نادر سکوں کا بکس زمین پر جا گرا اور اس کی آواز سے اچانک چچا کی آنکھیں جیسے خواب سے جاگ گئیں۔

''تم نے یہ آواز سنی'' دونوں ملازم کے شکنجوں میں پھنسے وہ میری طرف بے بسی سے تاک رہے تھے۔ ''ایک دن تمھیں اس کے لیے افسوس ہوگا۔''

''چلو بھی۔'' ابا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں میں۔'' چچا نے دونوں ملازموں سے خود کو الگ کیا، اپنی قمیض کا کالر ٹھیک کیا اور میرے پاس آئے۔ انھوں نے میرے دونوں گال چوم کر انھیں تھپتھپایا۔ وہ جب سر جھکائے ہوئے دونوں ملازموں کے درمیان چلتے ہوئے لوہے کے پھاٹک کی طرف واپس جا رہے تھے جہاں پاگلوں کا شور اور بھی بڑھ گیا تھا تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

''ان کا پاگلپن کب ٹھیک ہوگا؟'' باہر آ کر میں نے ابا سے سکتے ہوئے پوچھا۔ نادر سکوں کے بکس پر اب بھی میری انگلیاں لرز رہی تھیں۔ زمین پر گرنے کے سبب اس کے ایک کونے کا وارنش درک گیا تھا۔

''وہ کبھی پاگل نہیں ہوئے۔''

''پھر آپ لوگوں نے انھیں یہاں کیوں ڈالا؟''

"شاید اس لیے کہ اس پاگل دنیا کے اندر یہ تمہارے چاچا کے لیے سب سے محفوظ جگہ ہے۔"

میں نے ابا کی طرف دیکھا اور جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے کے چچا کلین شیوڈ ہو کر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس میرے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔

○ ○ ○

ایک ٹرام میرے سامنے آ کر رکی ہے اور میں نے اس سے ایک بھاری بھرکم لڑکی کو ہانپتے کانپتے باہر آتے دیکھا ہے۔ لڑکی کو میری نظریں نہیں بھاتیں۔ میری مسیں بھیگ چکی ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں سر جھکا لیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی دیر تک ٹرام کھڑی رہتی ہے، پھر ایک دھچکے کے ساتھ کنڈکٹر کی گھنٹی کا انتظار کیے بغیر چل پڑتی ہے۔ میں اٹھ کر پٹریاں پار کر کے پیچھے اپنے محلے کی طرف چل پڑتا ہوں جس کے مٹیالے آسمان پر اڑتے چیل اور کوؤں کے بیچ ایک دمدار پتنگ اپنا راستہ بھول چکی ہے۔

گذشتہ دس سال کے اندر اندر ہمارا پرانا پشتینی مکان چاروں طرف سے غیر قانونی طور پر تعمیر شدہ عمارتوں سے گھر گیا تھا جن میں عجیب طرح کے ناقابل بیان لوگ آ گئے تھے۔ ایک چلم بردار فقیر بھی تھا، جس نے ہماری دہلیز پر اپنا دائمی ٹھکانہ بنایا تھا اور جس کے وجود سے ہر وقت بھنگ کی بو آتی رہتی اور جو اب خود کو اس گھر کا ہی ایک فرد متصور کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بیڑی سلگاتے جھائیوں بھرا چہرا میری طرف اٹھایا۔

"بوا کا کالج پھر کھل گوا۔"

میں اس کے جملے پر چونک پڑا۔ کالج! ابھی تو میں نے دسویں کا امتحان ہی پاس کیا ہے۔ شاید میرے قد کے سبب وہ مجھے کالج کا اسٹوڈنٹ سمجھتا ہے۔ گھر کے اندر

چھوٹے چاچا کے بند کمرے کے سامنے سے گذرتے گذرتے میں ٹھٹھک گیا۔ آج اس کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے اندر کسی آدمی کے ہونے کی آہٹ کا احساس ہوا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"حاتم ہے۔" ماں نے پان چباتے چباتے کہا۔ "تمھارے چاچو کے علی گڑھ کے زمانے کا ساتھی۔ اس سے ملنے آیا ہے۔ کالج کے دنوں میں کئی بار آچکا ہے۔ اس وقت تم بہت چھوٹے تھے۔ شاید ہی تمھیں یاد ہو۔"

جانے کیوں مجھے اس کمرے میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ میرا ایک ذاتی کمرا تھا جس کے قد آدم دریچے پر کبوتر اپنی چونچ اور پنجوں سے یلغار کیا کرتے۔ اس کے بند شیشوں پر آپ کسی بھی وقت ان کے پروں کو مچلتے دیکھ سکتے ہیں۔ کتابیں کونے کی میز پر پھینک کر میں بستر پر جوتوں سمیت پیٹھ کے بل لیٹ گیا اور دسوں انگلیاں گردن کے پیچھے الجھا کر چھت کی طرف تاکنے لگا جس کی کڑیوں سے لپٹے جھول اور مکڑی کے جالے برسوں سے صاف نہیں کئے گئے تھے۔ پڑوس کے کسی گھر سے کیل ٹھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ میری کھڑکی سے دو ہات کے فاصلے پر ایک نئی عمارت کی نچلی منزل کی ایک کھڑکی کھلتی تھی جس سے ہر دوسرے تیسرے دن اور کبھی کبھی تو دن کے وقت بھی، ایک مرد اور عورت کے زور زور سے سانسیں لینے، کراہنے، چوڑیوں کے ٹوٹنے اور آپس میں سرگوشیاں کرنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔

"شٹ اپ!" میں کھڑکی پر بیٹھے کبوتروں کو (کبھی کبھی فرضی کبوتروں کو) اڑاتا۔ ملاعبت کی آواز بند ہو جاتی۔ پھر کم سے کم سرگوشیوں اور آہوں میں یہ کام اپنے انجام کو پہنچتا اور کمرے کے غسل خانے میں پانی کا شور جاگ اٹھتا۔

"ماں۔۔۔" ایک دن میں نے کہا تھا۔ "۔۔۔مجھے چاچو کا کمرا چاہئے۔ یہ کمرا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

''وہ کمرا تمھارے لیے ٹھیک نہیں۔'' ماں کہتی، پھر اپنی بات میں ایک جھوٹ کا اضافہ کرتی۔ ''اور پھر تمھارے چاچو کسی بھی دن ٹھیک ہو جائینگے۔ پھر تمھیں یہ کمرا چھوڑنا ہوگا۔''

''چھوڑ دونگا۔'' میں کہتا۔ ''میں نے کب چاچو کے کمرے میں ساری عمر گذارنی ہے۔''

''نہیں، وہ کمرا تمھارے لیے ٹھیک نہیں، اس میں ارمان کی بہت ساری قیمتی کتابیں اور کاپیاں رکھی ہیں، تمھارے ابا اجازت نہیں دینگے۔'' ماں تحکمانہ لہجے میں اپنا آخری فیصلہ سناتی اور میں سوچتا، ایک دن میں نادر سکّوں کے بکس کے ساتھ اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاؤنگا۔

میں اس طرح کیوں اس بکس کے بارے میں سوچتا، میں بتا نہیں سکتا لیکن جب بھی میں کسی گھاٹ پر اکیلا ہوتا تو دریا کے مٹیالے پانی کی طرف تاکتے تاکتے میں اس انجانے ملک میں پہنچ جاتا جہاں میں یہ بکس کھولنے والا تھا اور ان نادر سکّوں کے سبب وہ ملک ایک جادوئی ملک میں بدل جاتا جہاں چڑیاں مشینی تھیں اور انسان کے جسموں پر پانی نہیں ٹھہرتے اور سندر راجکماریاں اپنے آر پار نظر آنے والے لباسوں میں اپنے کاسنی نیل کے ساتھ دریا کے کنارے کی قد آدم گھاس کے جنگل میں بھاگ رہی ہوتیں۔ چاچو جو اس ملک کے بادشاہ تھے، جو اپنی ایک انگلی کے ایک اشارے پر سلطنتوں کو تباہ کر سکتے تھے اور آسمان سے پانی برسانے پر قادر تھے، میرے لیے ان کے دربار میں ایک خاص جگہ مخصوص تھی جہاں ستونوں پر آگ اگلنے والے سانپ لہراتے رہتے۔

○ ○ ○

حاتم میرے چاچا کی عمر کے ہی ایک دوسرے آدمی تھے جن کے سر کے سامنے کے سارے بال اڑ چکے تھے۔ انھوں نے لنن کی پتلون پر ایک ڈینم کا جیکٹ چڑھا رکھا تھا جس کے بٹن ان کی بھاری بھرکم توند کو سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے ہات پاؤں کے سبب وہ بالکل ہی مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے۔

''یہ بال میں نے کتابوں کی نذر کر دیے ہیں۔'' انھوں نے کھانے کی میز پر مجھے بتایا۔'' اور اگر آج تمھارے چاچا پاگل خانے میں ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ہم میں سے سب سے کم پاگل کو ہم پاگل خانہ بھیجتے ہیں۔''

وہ وہی بات کہہ رہا تھا جو میرا باپ کہا کرتا۔ مگر وہ میرے چاچو کے دوست تھے تو اتنے دنوں تک انھوں نے ان کی خبر کیوں نہیں لی؟

''میں نے ایک دوسرے ملک میں روپا مچھلیوں سے بھری ایک آرکائیو میں پناہ لے رکھی تھی جہاں سورج تک کو جھانکنے کی اجازت نہ تھی۔'' انھوں نے گوشت کے ایک کم گلے ٹکڑے کو چبائے بغیر حلق سے نیچے ڈھکیلنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ان کی آنکھوں سے پانی نکل آیا اور انھیں پانی کے گھونٹ کا سہارا لینا پڑا۔'' میرے بارے میں کہنے کے لیے اور بھی بہت ساری باتیں ہیں۔'' انھوں نے دونوں گال پر بہہ آئے آنسو کو رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔'' مثال کے طور پر میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ میں بہت دنوں تک زندہ رہنے والا ہوں اور ایک اندھے کی موت مرونگا۔''

مجھے ان کی اس عجیب وغریب گفتگو پر حیرت نہ ہوئی بلکہ مجھے پورا یقین ہو گیا کہ وہ میرے چاچو کے قریبی دوست تھے۔ بعد میں جب ہم چاچا کے کمرے میں اکیلے ہوئے تو انھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے میری طرف دیکھا (انھوں نے اپنے جیکٹ کے سارے بٹن کھول دیے تھے) اور کہا۔

''تم سوچ رہے ہو گے میں کہاں سے ٹپک پڑا۔''

''ہاں۔''

''اور یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ اس نادر سکوں کے بکس کے بارے میں میں جانتا بھی ہوں یا نہیں۔''

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''یہ بکس کالج کے دنوں میں بھی ارمان کی سب سے قیمتی چیزوں میں شامل تھا۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔'' اس کے سبب ہم لوگ اس کا مذاق بھی اڑایا کرتے مگر ہم میں سے کسی کو بکس کھولنے یا اس کے اندر جھانکنے کی اجازت نہ تھی۔''

''میں ایسے کسی بکس کے بارے میں نہیں جانتا۔'' میں نے جھوٹ کہا۔

''بیکار ہے۔ تمھارے چاچو نے مجھے خط میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ مجھے احمق سمجھتا تھا اس لیے مجھ سے کچھ بھی چھپاتا نہ تھا۔ گھبراؤ مت، میں وہ بکس لینے نہیں آیا ہوں۔ گرچہ اسے حاصل کر کے مجھے کم خوشی نہ ہوگی۔ تم خوش قسمت ہو اور تمھارے چاچا نے ضرور تمھارے اندر کچھ دیکھا ہوگا کہ انھوں نے بکس تمھارے حوالے کیا۔ تم نے اسے کھول کر دیکھا تو ہوگا؟''

''نہیں۔''

''حیرت ہے۔ شاید تمھارے اندر اس طرح کی چیزوں کے لیے کوئی تجس نہیں ہے۔ وہ بکس لاؤ۔ اسے کھول کر دیکھتے ہیں۔''

''اس کی کنجی میرے پاس نہیں ہے۔ چاچو نے غلط کنجی مجھے دی تھی۔'' اس بار میں سچ کہہ رہا تھا کیونکہ پاگل خانے سے واپسی کے بعد میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تھی۔

''میں جانتا ہوں۔'' حاتم نے مسکرا کر کہا۔'' لیکن تم نے کبھی صحیح کنجی ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

"مجھے کچھ ہی دن قبل اس کا پتہ چلا۔"

تو انھوں نے اپنا چرمی سوٹ کیس کھولا، اس سے ایک چھوٹی سی ہینڈ بیگ برامد کی اور اس کے سائڈ چین سے پیتل کی ایک مجوف کنجی نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ رہی صحیح کنجی۔ تمھارے چاچا نے خط کے ساتھ لفافے میں اسے ڈال کر بھیجا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے راستے میں کسی نے نہیں کھولا اور یہ لفافہ کنجی کے ساتھ سفر کرتا ہوا سات سمندر پار اس بغیر دھوپ والے ملک تک پہنچ گیا۔"

"جب یہ بکس آپ کے پاس نہ تھا تو انھوں نے یہ کنجی آپ کو کیوں بھیجی؟" میں نے کنجی کو تھام کر کہا۔ کنجی تھامتے ہوئے جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔" انھوں نے لاپروائی سے کہا۔ "اب تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید اس نے ایسا اس لیے کیا تھا تاکہ صحیح وقت پر صحیح کنجی تمھیں مل جائے۔"

کنجی تھام کر میں ان کی طرف گومگو کی کیفیت میں تاک رہا تھا جب انھوں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں یہ تمھارا نجی معاملہ ہے اسی لیے میں اسے میرے سامنے کھولنے پر اصرار نہیں کروں گا، بلکہ بہتر ہوگا اگر تم میرے جانے کے بعد بکس کو کھول کر دیکھو۔"

دوسرے دن میری آنکھ کھلنے سے پہلے ہی فجر کی نماز پڑھ کر وہ جا چکے تھے۔ میں نے نادر سکوں کا بکس نکال کر کھڑکی پر رکھا جس پر فالحال کوئی کبوتر نہ تھا۔ پڑوس کی کھڑکی بھی خاموش تھی۔ میں نے کنجی کو بکس کے کلیدی سوراخ میں ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ بکس نے کھلنے سے انکار کر دیا۔

میرا شبہ صحیح نکلا۔ یہ پہلی کنجی کی کاپی ہی تھی۔

مجھے اس گنجے، مکڑی کی توند والے اسکالر کی احمقانہ مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی جو اس وقت ٹرین کی کھڑکی کے سامنے بیٹھا اپنی مشن پوری کرنے کی تشفی کے ساتھ

بردوان کے لہلہاتے کھیتوں کی طرف تاک رہا ہوگا۔
یا پھر کون جانے، چاچو نہیں چاہتے تھے کہ یہ بکس کبھی کھلے۔

○ ○ ○

اور تب مجھے میرا آدمی اچانک نظر آ گیا۔ وہ ایک لانچ میں کھڑا مسافروں کو جادو دکھا رہا تھا۔ پہلے تو اس نے منھ کھول کر ایک چوڑے پھل والا لانبا تیز چاقو اس کے مٹھ تک اپنے حلق کے راستے پیٹ کے اندر ڈال لیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر لانچ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلتا پھرا۔ پھر اس نے انسانوں کے سر کی جسامت کے آہنی حلقے اپنی سیاہ تھیلی سے، جس پر انسانی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کی تصویریں بنی تھیں برآمد کیے اور بڑے ہی حیرت انگیز طریقے سے انھیں ایک دوسرے کے اندر نتھی کرنے لگا جب کہ حلقوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا، جس کی تصدیق کئی تماشبین ہاتھ سے چھو کر کر چکے تھے۔ تماشہ دکھا کر جب وہ میرے پاس آیا تو میں دیر تک اسے دیکھتا رہ گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی بوسیدہ گولف کیپ سر پر سیدھی کر کے مسکرانے کی کوشش کی اور جب کہ لانچ دوسری طرف کے گھاٹ پر پہنچنے ہی والا تھا اور نصف سے زیادہ مسافر بینچوں سے اٹھ چکے تھے وہ ایک خالی بینچ پر بیٹھ کر کھینی بنانے لگا اور پانی پر تھوکنے لگا۔

جیٹی سے لگتے ہی لانچ دیکھتے دیکھتے مسافروں سے خالی ہو گیا تھا۔ صرف ہم دونوں الگ الگ جگہ بیٹھے ایک دوسرے کو تاکتے رہے۔ لانچ کے بینچ ایک بار پھر مسافروں سے بھرنے لگے تھے جب وہ مسکرایا اور اٹھ کر میرے پاس چلا آیا۔ ہم ایک ساتھ لانچ سے باہر آئے تھے۔

''کوئی خاص بات؟'' اس نے اپنے نیچے کے ہونٹ کو باہر کھینچ کر اس پر کھینی

رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس ایک بکس ہے۔'' میں نے کہا۔

''بہت خوب۔''

''اس پر ایک تالا پڑا ہے جو نہیں کھلتا۔''

''تو اسے کسی تالا کھولنے والے کو دکھاؤ۔''

''میں چاہتا ہوں کہ میرا بکس تالا کے بغیر کھل جائے۔ اور تم یہ کام کر سکتے ہو۔''

''تمھیں لگتا ہے میں سچ مچ کا جادوگر ہوں اور جادو نام کی ایک چیز بھی ہے دنیا میں۔'' وہ ہنسا اور اس کے کھینی خوردہ سیاہ دانت نمایاں ہو گئے۔ ''یہ دنیا بھی عجیب ہے۔ ہم دوسروں کے بارے میں کیا کچھ سوچ لیتے ہیں۔ کوئی پردے کے پیچھے جھانکنے کی محنت ہی نہیں کرتا۔ پھر بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔ تم وہ بکس یہاں لے کیوں نہیں آتے۔ تم مجھے آسانی سے ڈھونڈ سکتے ہو۔ میں تمھیں کسی نہ کسی جیٹی پر یا لانچ کے اندر تماشہ دکھاتا نظر آؤں گا۔''

''کل کالج کے بعد ٹھیک تین بجے میں بکس کے ساتھ چاند پال گھاٹ پر تمھارا انتظار کروں گا۔''

دوسرے دن چاند پال گھاٹ کی سنسان جیٹی کی سیڑھی پر بیٹھ کر، جہاں تیز ہوا چل رہی تھی، (وہ مقررہ وقت سے تقریبا آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا تھا) اس نے بکس پر انگلیاں پھیریں، اسے الٹ پلٹ کر، ہلا ڈلا کر دیکھا، اپنے کان سے لگا کر اندر سننے کی کوشش کی، دیر تک اس کے کلید کے سوراخ کے اندر جھانکتا رہا اور آخر کار تھک کر اس کے قبضوں کو ڈھونڈنے لگا جو اسے نظر نہیں آئے۔ وہ نظر آتے بھی کیسے۔ وہ تو بکس کے اندر کی طرف بنے ہوئے تھے۔ تھک کر اس نے میری طرف دیکھا۔

''یہ ایک غیر معمولی بکس ہے۔'' اس نے دونوں کنجیوں کو ایک دوسرے سے ملا کر

دیکھتے ہوئے کہا۔" تم اسے کسی تالا والے سے ہی کھلوا سکتے ہو، یا پھر اس بکس کو توڑ کیوں نہیں ڈالتے ؟ تمھیں اس سے خوبصورت بکس بازار میں مل جائینگے۔"

"تو وہ لوہے کے حلقوں والا تماشہ ایک فریب تھا۔ مجھے پہلے ہی جان لینا چاہیے تھا۔ تم میرے آدمی نہیں ہو۔" میں نے اس سے بکس واپس لیتے ہوئے کہا۔

"وہ آنکھوں کا فریب تو تھا، لیکن تم اتنی جلد فیصلہ نہ کرو۔ ہو سکتا ہے میں واقعی تمھارا آدمی نکلوں۔"

"نہیں تم میرے آدمی نہیں ہو سکتے۔" میں نے اس کی طرف پیٹھ گھماتے ہوئے کہا۔" تمھیں دو وقت کی روٹی سے فرصت نہیں۔ جب کہ میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں اس کے پاس وقت ہی وقت ہے۔"

جیٹی سے باہر آ کر دریا کے کنارے چلتے چلتے میں نے دیکھا، ایک لانچ مسافروں کو لے کر بہت ہی خطرناک حد تک ایک طرف جھکا ہوا جیٹی سے واپس لوٹ رہا تھا جس کے اندر وہ مسافروں کی بھیڑ میں کھڑا ایک زندہ سانپ نگلنے کا تماشہ پیش کر رہا تھا۔ اس کے بعد بھی ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر ایک دن وہ اور دکھائی نہ دیا۔ شاید لوگ روز روز ایک ہی تماشہ دیکھتے دیکھتے اوب گئے تھے یا شاید ایک ہی طرح کے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے وہ بور ہو گیا تھا۔

○ ○ ○

ہمیں خبر ملی ہے کہ چاچو پر پاگل پن کا شدید دورا پڑنے لگا ہے اور انھیں بجلی کے کافی ہولناک جھٹکے دیے جا رہے ہیں۔ ایک بار میں بھی بڑے چچا کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ انھیں ایک کمرے میں، جس کی دیواروں پر گدے چپاں تھے، زنجیر سے جکڑ کر رکھا گیا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے پاگل کا داہنا کان نصف چبا ڈالا تھا۔ انھیں

ہماری موجودگی پر حیرت ہوئی۔ وہ جب دروازے کی سلاخوں کے پاس آئے تو مسکرا رہے تھے۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' بڑے چچا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا۔

''بالکل چنگا، سر۔'' وہ ہنسے۔ ہم نے دیکھا، ان کے سامنے کے دو دانت غائب تھے اور کنپٹی پر کسی گہری چوٹ کے سبب ان کی داہنی آنکھ بائیں آنکھ کے مقابلے میں کچھ چھوٹی ہوگئی تھی۔ ''اور تم؟'' انھوں نے اپنے ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے ہاتھوں کو اٹھا کر میری طرف اشارا کیا۔ ''حاتم کہہ رہا تھا تم واقعی ایک الگ قسم کے لڑکے ہو۔''

''وہ یہاں آئے تھے؟'' میں نے پوچھا اور دروازے کی موٹی سلاخوں کے اندر ہاتھ بڑھا کر چاچو کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، مگر پاگل خانے کے ملازم نے مجھے روک لیا۔

''ہاں، اور اس نے اپنے گنجے سر پر طبلا بجانے کی اجازت بھی دی تھی۔'' وہ دوبارا ہنسے۔ ''اس سے بڑا گدھا میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ خیر، اب وہ اپنی بوسیدہ کتابوں کی دنیا میں جا چکا ہے۔ اس نے تمھیں بتایا تو ہوگا۔ لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ مرنے کے بعد اس کے نتھنوں سے بڑی بھاری تعداد میں روپا مچھلیاں برآمد ہوں گی اور وہ ساری کی ساری بہت ہی جید اور دانشور مچھلیاں ہوں گی۔''

میں وہاں سے بہت پریشان ہو کر واپس لوٹا تھا۔ میں نے ان کے دیے ہوئے بکس کو ہر زاویے سے الٹ پلٹ کر، ہلا ڈلا کر دیکھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بکس کے اندر ایسا کوئی راز چھپا تھا جو چاچو کو اس کے پاگل پن کی دنیا سے واپس لے آئے گا۔ لیکن مجھے اس کا بھی ڈر تھا کہ تالا کے کھلتے ہی وہ راز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو نہ جائے۔ کیا یہی وہ تذبذب تھا جس نے مجھے ہمیشہ بکس کو کھولنے سے باز رکھا؟

اس کے بعد شاید چاچو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ ایک دن پاگل خانے سے

بھاگ نکلے اور اس سے ملحق ایک رہائشی بنگلہ کی دیوار پر لگائے گئے بجلی کے حفاظتی تاروں میں ان کی ادھ جلی لاش الجھی ہوئی ملی۔ لاش بری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ انھیں پاگل خانے کے قبرستان میں ہی دفنا دیا گیا۔ مجھے تک اس میں شامل ہونے کی اجازت نہ ملی جس سے مجھے پتہ چلا کہ لاش کچھ ضرورت سے زیادہ مسخ ہو چکی تھی۔

چاچو کے انتقال کے بعد میں وہ بکس الماری کے بہت اندر رکھ کر بھول گیا۔ میں نے شہر کو نئے سرے سے دریافت کرنے کی کوشش کی، نئے نئے راستے اپنائے جہاں لوگوں کے چہرے بالکل اجنبی اور حیرت انگیز تھے۔ ایسی گلیاں دیکھیں جہاں ہر دوسری گلی میں ایک نیا چاند چمک اٹھتا۔ ایسی شاہراہوں سے گذرا جن پر میلوں چل کر بھی لوگ خود کو پہلی جگہ پر ہی پاتے۔ میں نے ایک غمگین مگر کم سخن آدمی کا دور تک پیچھا کیا اور آخر کار اسے اپنی کہانی سنانے پر مجبور کر دیا اور یہ کہانی بھی کتنی دردناک تھی جیسے شہر کا چمکیلا آسمان اچانک منحوس کووں سے ڈھک جائے، جیسے ایک پرسکون رات فسادیوں کے شور سے جاگ اٹھے، جیسے درختوں سے پتے دائمی طور پر جھڑنے لگیں، جیسے دور خلا میں چمکتے ستاروں سے راکھ کا گرنا شروع ہو جائے، جیسے راستوں پر چلنے والے راہگیر فریب ثابت ہوں اور فنا اور بقا کے سارے مفاہیم بدل کر رہ جائیں۔

لیکن ان سب چیزوں سے آخر کار میں تھک گیا۔ اب میرے پیروں میں اتنی سکت نہ تھی کہ دو قدم بھی چل پاتا۔ میں کسی کھمبے سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھوں کو خشک رکھنے کی کوشش کرتا تو آسمان سے بارش کی بوندیں لگاتار گرتی چلی جاتیں جب کہ اس وقت بادلوں کا نام و نشان نہ ہوتا اور میں اس پراسرار بارش میں شرابور چھتری بردار لوگوں کے بیچ ایک نابود ہستی کی طرح چلتا چلا جاتا۔ اور ایسی ہی ایک پراسرار بارش کے دن بکس کو بغل میں دبائے، میں ایک سرکاری بس کے پائدان سے ایک بڑی سڑک پر اتر آیا جس پر آزادی کا شاندار جشن منایا جاتا تھا اور دریا کی طرف چل پڑا۔

بارش اور کہاسے کے سبب دریا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نہ نظر آنے والے دریا کے کنارے تارکول کی سڑک پر چلتا رہا اور چلتے چلتے ایک گھاٹ پر پہنچ گیا جس کے وسیع و عریض زینے پر دریا کا پانی بہت اوپر تک آگیا تھا اور دھوئیں کی طرح مچل رہا تھا۔ میں اس کی آخری سیڑھی پر کھڑا دریا کے دوسرے کنارے تاک رہا تھا جو کہاسے میں غرق دریا کا حصہ ہی نظر آرہا تھا۔ جانے کتنا وقت گذر گیا جب مجھے اپنی بغل میں دبے ہوئے بکس کا احساس ہوا اور میں اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ بکس کے نیچے مچلتے پانی کی طرف تاکتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لہریں انسانی انگلیوں کی شکلیں لے کر بکس کو گرفت میں لینا چاہ رہی ہوں۔ میں نے بکس کو پانی کے حوالے کر دیا۔ نادر سکوں کا بکس پہلے تو پوری طرح اندر ڈوب گیا اور ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ شاید اب وہ دکھائی نہ دے جب اچانک غوطہ کھا کر باہر نکل آیا۔ وہ ایک موج کی زد میں آکر سیڑھی سے ٹکرایا اور پلٹ کر جیٹی سے لوٹتے کسی مسافروں سے بھرے لانچ کی طرح ایک طرف جھکا ہوا گھاٹ سے دور جانے لگا۔

بارش اور کہاسے میں پانی پر وہ کسی تابوت کی مانند نظر آرہا تھا۔

میں نے چاچو اور حاتم کی دی ہوئی دونوں کنجیاں پانی میں پھینک دیں۔

اس رات میں نے خواب میں دیکھا بکس بہتے بہتے جادوئی ملک میں پہنچ گیا تھا جہاں کی چڑیاں مشینی تھیں اور انسانی جسموں پر پانی نہیں ٹھہرتے اور سندر راجکماریاں اپنے آرپار نظر آنے والے لباسوں میں اپنے کاسنی بیل کے ساتھ دریا کنارے اگی ہوئی قد آدم گھاس کے جنگل میں بھاگ رہی تھیں اور چاچو جو اس ملک کے بادشاہ تھے، جو اپنی انگلی کے اشارے پر سلطنتوں کو تباہ کر سکتے تھے اور آسمان سے پانی برسانے پر قادر تھے، ان کے دربار میں میرے لیے ایک خاص جگہ مخصوص تھی جہاں ستونوں پر آگ اگلنے والے سانپ لہراتے رہتے۔

○ ○ ○

کتّا گاڑی

ساحل کو سیاحوں کے لیے زیادہ آرامدہ بنانے کے لیے حکومت نے جو پہلا منصوبہ تیار کیا وہ اسے آوارہ کتوں سے پاک رکھنے کا تھا جو اپنی دُم اٹھائے سمندر کے کنارے بلا روک ٹوک گھوما کرتے، یہاں تک کہ موجوں کے ساتھ بھی چھیڑ خانی کرنے سے باز نہ آتے۔ مگر بوڑھا رامانجن پلّے اس معاملے میں زیادہ دانشمند تھا۔ چونکہ اس کا گھر ساحل سے لگا ہوا تھا صبح شام ہوا خوری کے لیے اسے یہی جگہ راس آتی۔ اسی ساحل پر اس کا بچپن بھی گذرا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ ساحل پر گھومنے والے ان کتوں کو دیکھتا آیا تھا مگر اسے پتہ تھا یہ کتے بھلے ہی سڑک چھاپ ہوں، بھلے ہی ان کے جسم گھاؤ سے بھر چکے ہوں اور بدن کے زیادہ تر بال اڑ چکے ہوں، بھلے ہی ان کے مقعد آتشک کے سبب بھاری ہو کر لٹک گئے ہوں، ساحل پر آنے والوں کی چھوڑی ہوئی گندگی کو صاف کرنے میں ان کا کردار کسی خاکروب سے کم نہ تھا، یہاں تک کہ ایک دن اس نے ایک کتے کو ایک مانع حمل کی تھیلی چباتے دیکھا جس کے اندر مادہ منویہ بھرا ہوا تھا۔

''جس دن یہ کتے اور کوّے نہ ہونگے سارا شہر غلاظت کا ڈھیر بن کر رہ جائے گا، سڑاندھ دائمی طور پر ہوا میں بس جائگی اور ہم میں سے ہر کوئی اپنی ناک سے پریشان دکھائی دیگا۔'' اس نے اپنی کم سخن بیوی سے کہا۔ پلّے پچیس برس پہلے کو چمنا کو کوزی کوڈ

کے ایک پڑھا لکھا گاؤں سے بیاہ کر لایا تھا اور اب جب کہ اس کے دونوں جڑواں بیٹے نوکری کے سلسلے میں کھاڑی کے ملکوں کی خاک چھان رہے تھے وہی اس کی پوری کائنات بن کر رہ گئی تھی۔ کوچما کم سخن تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ بے چون و چرا ہر بات قبول کر لیتی۔

''شاید اس سلسلے میں ان کی معلومات تم سے بہتر ہو۔'' اس نے اپنا منھ کھولتے ہوئے کہا۔ ''آخر انتظامیہ ساری زندگی یہی تو کرتا آرہا ہے۔''

پلّے مسکرایا۔ کوچما اس کے لیے ایک اچھی counter-weight ثابت ہوئی تھی جس کے سبب اس کی زندگی میں ایک توازن آ گیا تھا ورنہ وہ ایک پنڈولم کی طرح تا عمر اپنی انتہاؤں سے ٹکراتا رہتا۔ ایک بار کے لیے اس نے سوچا وہ اس معاملے کو ذہن سے نکال دے مگر دوسرے دن جب وہ ہوا خوری کے لیے نکلا تو اس نے واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ کے سامنے ریت پر ایک کتا گاڑی کو کھڑا پایا۔ اس کا ڈرائیور گاڑی کے بانیٹ سے پیٹھ لگائے کھڑا دور سمندر کی طرف تاک رہا تھا جہاں کتے پکڑنے والے گئے ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب سمندر کے کنارے سیاحوں کی پوری بھیڑ کھنچ آتی جس کے پیچھے پیچھے کتے بھی شہر کی گلیوں بازاروں سے ہوتے ہوئے ساحل پر نکل آتے۔

''یہ کتا گاڑی ہے؟'' پلّے نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

''ہاں، کیا آپ پنجڑے پر لگی تختی پر کتے کی تصویر نہیں دیکھتے۔'' ڈرائیور اپنی ٹوپی اٹھا کر سر کھجاتے ہوئے بولا۔ اس کے بال حبشیوں کے بالوں کی طرح گھنے اور گھنگریالے تھے۔ ''بوڑھے بابا اپنے کتے سے پیچھا چھڑانا ہو تو اسے یہاں لا سکتے ہو یا کسی آوارہ کتے کی خبر دینی ہو تو تختی پر فون نمبر درج ہے۔''

''نہیں، میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔'' پلّے آگے بڑھ گیا۔

جاڑے کا موسم تھا اور ساحل دور تک سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا سرخ

کھپریل کے چھپروں والا مکان گرچہ بالکل سمندر کے کنارے واقع تھا اور اس کا ٹیرس بطور خاص سمندر کے رخ پر بنایا گیا تھا، مگر یہ سیاحوں والا علاقہ نہ تھا اس لیے ادھر لوگ کم آتے۔ پلّے جب ہواخوری کے لیے نکلتا تو ریت پر بہت دور تک وہ تنہا آدمی ہوتا۔ پھر وہ ماہی گیروں کی ایک بستی کے سامنے سے گذرتا جو کھاڑی ملکوں کے پیسوں سے بنائے ہوئے خوبصورت مکانوں کے بیچ اب بھی اپنے ناریل کے قدیم درختوں اور صدیوں پرانی جھونپڑیوں کے ساتھ جوں کی توں موجود تھی۔ مچھیروں کی کشتیاں جب جھنڈ کی شکل میں واپس لوٹتیں تو سمندر کا یہ کنارا مچھلی کے ایک بازار میں بدل جاتا۔ یہاں سے ساحل کشادہ ہونے لگتا اور اکا دکا سیاح یا راہگیر یا مچھیرے جال ٹوکری یا ہانڈی اٹھائے ملنا شروع ہو جاتے۔ یہاں سے ہر قدم پر بھیڑ بڑھنے لگتی اور اس جگہ جہاں بڑے چھوٹے ہوٹلوں رستورانوں اور دکانوں کا ہجوم تھا وہاں اوپر سڑک سے لے کر نیچے ساحل کی غلیظ ریت تک گویا بازار سا لگا ہوا تھا۔ پلّے عام طور پر اس جگہ سے گریز کرتا مگر آج وہ اس بھیڑ کے اندر چل رہا تھا۔ شاید اسے کتا پکڑنے والوں کی تلاش تھی۔ مگر اسے دور تک کوئی کتا پکڑنے والا دکھائی نہ دیا۔ واپسی پر اس نے دیکھا کتا گاڑی بھی اپنی جگہ سے غائب تھی۔ اس نے سارا راستہ کتوں کو دم اٹھائے آزادی سے گھومتے دیکھا اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف پایا۔ شاید ان کا ایسا کوئی ارادہ نہ ہو، اس نے سوچا۔ سرکار کے سارے کام کاج کی طرح یہ بھی صرف دکھاوا ہو، پیسہ بانٹنے کا کوئی نیا طریقہ ہو۔

''کوچما۔۔۔'' وہ اسکے لیے میز پر کافی کا مگ رکھ رہی تھی جب پلّے نے اخبار نیچا کر کے اپنی عینک کے اندر سے تاکتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کبھی کتا گاڑی دیکھی ہے؟''

''جانے تم کیا کیا دیکھتے رہتے ہو۔'' کوچما میز کی دوسری طرف بیٹھ کر کچی سبزی کی رکابی اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاس دیکھنے کے لیے اور بھی اہم

چیزیں ہیں۔"

"دنیا میں چیزیں ہوں تو نظریں پڑ ہی جاتی ہیں۔" پلّے نے خفگی کے ساتھ کہا۔ کبھی کبھار اسے کوچما کی بے حسی پر غصہ آجاتا۔" خاص کر ایک ایسی دنیا میں جس کا انسان مالک بن بیٹھا ہو۔"

"اس دھرتی پر انسان اور جانور دونوں جی تو رہے ہیں۔"

"نہیں۔" اس نے ضد کے ساتھ کہا۔" اب ساری چیزیں انسانوں کی اجارہ داری بن کر رہ گئی ہے۔ وہ جانوروں، پیڑ پودوں، پانی اور ہوا کا مالک بن بیٹھا ہے۔ اسے یہ ملکیت کس نے دی؟ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، ہم سب کیسے ان سب چیزیوں کے دعوے دار ہو گئے۔ ہم سب لٹیرے ہیں جنہوں نے خدا کی زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے، اس کا الگ الگ حصہ لگا لیا ہے۔"

کوچما انہماک سے سبزی کاٹتی رہی۔

'تم خوامخواہ کی باتوں کو بہت سوچتے ہو۔" اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "آخر یہ دنیا چل تو رہی ہے۔"

پلّے نے بات کو مزید آگے بڑھانا ضروری نہ سمجھا۔ مگر دوسرے دن اس نے کتا گاڑی کو اپنی مخصوص جگہ پر کھڑا پایا۔ اس بار اس کے پنجڑے میں دو مرگھلے کتے دمیں ٹانگوں کے بیچ دبائے خاموش کھڑے تھے۔ پلّے کو دیکھ کر اس میں سے ایک نے بھونکنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

"تم لوگ ان کا کیا کرو گے؟" پلّے نے ڈرائیور سے پوچھا جو کل کی طرح بانیٹ سے پیٹھ لگائے کھڑا سمندر کی طرف تاک رہا تھا۔

"اگلی دنیا کو پارسل کرینگے۔" اس نے گذشتہ کل کی طرح ٹوپی اٹھا کر سر کھجاتے ہوئے کہا۔ شاید اس کے گھنے بالوں میں جوں نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔

''ان سالوں کا وہی صحیح ٹھکانہ ہے۔آپ کو کبھی کسی کتے نے کاٹا ہے؟''

''نہیں،'' پلّے نے کہا۔''مگر اس سے فائدہ؟ جلد یا بدیر دوسری دنیا میں ہم بھی ہونگے۔ وہاں ان سے ملاقات تو ہو ہی جائیگی۔''

''بوڑھے بابا۔۔''ڈرائیور نے ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا۔''جانے آپ کیا کہہ رہے ہو۔ہم تو اپنا کام کر رہے ہیں۔''

اس دن پلّے نے ساحل پر دونوں کتے پکڑنے والوں کو دیکھا۔ وہ لوہے کے شکنجے اٹھائے لمبی لمبی ڈگ بھر رہے تھے۔ پہلا لانبا، دبلا پتلا، بالکل شفاچٹ تھا یہاں تک کہ اس کا گنجا سر ایک بڑے سے انڈے کی طرح چمک رہا تھا۔اس نے داہنے کندھے پر ٹاٹ کا ایک گندا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح نکلی ہوئی تھی اور منہ کھولنے پر اس کے لمبے دانت گھوڑوں کے دانتوں کی طرح روشن ہو جاتے۔دوسرا کافی لحیم شحیم، گھنگریالی داڑھی والا آدمی تھی جس کی جلد تانبے کی تھی اور سارا جسم کسی دریائی گھوڑے کی طرح تھل تھل کر رہا تھا۔ وہ ایک دریائی گھوڑا ہی تھا۔اس نے جینز اور بغیر آستین کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور چیونگم چبا رہا تھا۔دونوں چلتے چلتے پلّے سے تھوڑے فاصلے پر رک گئے۔ان کے سامنے سے ایک کتا گذر گیا مگر وہ خاموش کھڑے رہے۔ پھر شکنجے اٹھائے اوپر ہوٹلوں والے علاقے کی طرف بڑھ گئے۔

''ساحل پر کتے پکڑنے والے آگئے ہیں۔''اس دن گھر واپس لوٹ کر اخبار کھولتے ہوئے پلّے نے کوچما سے کہا جو میز پر اس کے لیے بسکٹ کا مرتبان رکھ رہی تھی۔

''ایسا لگ رہا ہے تم اخبار سے یہ خبر پڑھ کر سنا رہے ہو۔''کوچما نے مذاق کے لہجے میں کہا جو پلّے کو پسند نہ آیا۔اس نے چہرا اخبار میں چھپا لیا۔کوچما کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''تم ان کے لیے کچھ کرتے کیوں نہیں؟''

''کن کے لیے؟'' اس نے اخبار سے سر اٹھا کر کہا۔

''ان کتوں کے لیے۔''

''تمہارا مطلب ان آوارہ کتوں سے ہے۔ یہ ویسے بھی غیر قانونی کتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ قانون انسانوں کا بنایا ہوا ہے کتوں کا نہیں۔''

''پھر تو تمہارے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔''

نہیں، میں کچھ تو کرسکتا ہوں، اس نے سوچا۔ اخبار پڑھ کر وہ دوبارا باہر نکل آیا اور کتا گاڑی کی طرف چل پڑا جو اپنی جگہ کھڑی تھی، صرف ڈرائیور کہیں گیا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا پنجڑے میں کم از کم سات کتے ہونگے۔ وہ لوہے کی جالی کو پنجوں سے کھرچ رہے تھے، غرا رہے تھے، ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے، ایک دوسرے کا مقعد سونگھ رہے تھے۔

''شاید تم لوگ اسی لائق ہو۔'' پلّے نے سوچا پھر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ جب اسے اطمینان ہوگیا کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا تھا تو اس نے پنجڑے کے دروازے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جو اسے آسانی سے مل گیا کیونکہ ایک چھوٹا سا قفل اس سے لٹک رہا تھا۔ اس نے قفل کو تھام لیا اور زور لگا کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ قفل چھوٹا تھا اور کم قیمت کا بھی نظر آرہا تھا مگر اسے بہت جلد پتہ چل گیا کہ اسے اس طرح سے کھولنا ممکن نہ تھا۔ اس نے سمندر کی طرف اور پھر واپس اوپر واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ کے سامنے کی سڑک پر نظر دوڑائی جس سے مسافروں سے ٹھساٹھس ایک بس ابھی ابھی دھول اڑاتے ہوئے گذری تھی۔ اسے سڑک کے کنارے کچھ پتھر نظر آئے جو سڑک سے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی طرح باہر نکل آئے تھے۔ ان میں سے ایک پتھر اٹھا کر وہ کتا گاڑی کی طرف لوٹ رہا تھا جب اس نے دونوں کتا پکڑنے والوں کو خالی ہاتھ اپنے

شکنجوں کے ساتھ واپس لوٹتے دیکھا۔ پلّے نے پتھر پھینک دیا۔ دونوں کے گاڑی تک پہنچنے سے قبل ڈرائیور کی ٹوپی دکھائی دی۔ وہ ساحل پر بھالو کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ تینوں گاڑی کے اندر بیٹھ کر چلے گئے۔ دور جاتی گاڑی کے اندر سے کتے پلّے کی طرف تاک رہے تھے جیسے انھیں اس سے مایوسی ہوئی ہو۔

اس دن پلّے گھر میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کوچمانے اس سے ایک دو بار پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر وہ ٹال گیا۔ دوسری صبح جب وہ سیر کے لیے نکلا تو کوچمانے دیکھا وہ لوہے کا ایک اوزار لیے ہوئے تھا۔

''تم اس کا کیا کروگے؟ اسے کہاں سے حاصل کیا تم نے؟''

''لوہار گومز سے خاص طور پر بنوایا ہے۔ اس سے کسی بھی قسم کا تالا آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔''

''دیکھو تم کسی مصیبت میں نہ پڑ جانا'' کوچمانے خوفزدہ ہو کر کہا۔ اپنی لمبی ازدواجی زندگی میں اس نے پلّے کو بہت سارے ایسے کارنامے کرتے دیکھا تھا جن کا سر پیر شروع میں اس کی سمجھ میں نہیں آتا مگر جن کا خاتمہ کسی بھیانک واقعے پر ہوتا۔ مگر پلّے کو کون سمجھائے۔ وہ کوئی عام آدمی تو نہ تھا۔

''تم بس اپنا منہ بند رکھنا'' اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

○ ○ ○

ڈرائیور اپنی گاڑی کے بانیٹ پر ہاتھ کا تکیہ بنائے جاڑے کی دھوپ میں لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا جب پلّے نے قفل کے اندر لوہے کو ڈال کر اسے آسانی سے توڑ ڈالا۔ دروازہ کھلتے ہی تینوں کتے بھونکتے چلاتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک نے پلّے کو کاٹنے کی بھی کوشش کی مگر اسکے ہاتھ میں لوہے کے اوزار کو دیکھ کر

دم ٹانگوں کے بیچ دبائے بھاگ نکلا۔

ڈرائیور کو کتا پکڑنے والوں نے نیند سے جگایا تھا۔ 'طوطے کی چونچ' نے ٹوٹا ہوا تالا اس کے چہرے کے سامنے لٹکاتے ہوئے کہا۔ "سب کتے بھاگ نکلے ہیں۔ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟"

"مجھے کیا پتہ۔" ڈرائیور چکا چوندھ آنکھوں سے خالی پنجڑے کے اندر تاک رہا تھا۔ "مجھے حیرت ہے، ان مرگھلے کتوں سے کسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"آئندہ خیال رکھنا۔" 'دریائی گھوڑے' نے شکنجہ پنجڑے کے اندر پھینک کر چیونگم کا بچا ہوا ٹکڑا تھوکتے ہوئے کہا۔ "اب واپس چلو۔ ساحل پر ابھی کتے کم ہیں، شاید وہ بھی ہوشیار ہونے لگے ہیں۔"

○ ○ ○

پلّے پچھلے تین دنوں سے خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے ان تین دنوں میں ایک بار اور بھی کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ ٹیرس پر چہل قدمی کرتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ اس نے آج کو چما کو کچن کے کام میں بھی مدد دی تھی اور اب وہ چٹائی پر بیٹھا گھر کے پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا جو پیلے پڑ گئے تھے۔ یہ ان کے باپ کے کاغذات تھے جو ملیالم کا ایک گمنام شاعر تھا۔ وہ انھیں ایک جگہ جمع کرنے کی سوچ رہا تھا۔

"تم آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔"

"پچھلے دو دن سے کتا گاڑی نہیں آئی۔" پلّے نے کہا۔ "لگتا ہے انھوں نے یہ مہم روک دی ہے۔"

مگر یہ اس کا بھرم نکلا۔ دوسرے دن کتا گاڑی اپنی جگہ ثابت و سالم اپنے پہیوں پر کھڑی تھی۔ اس کے اندر تین کتے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور ڈرائیور ہمیشہ کی طرح

بانیٹ سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔ پنجڑے کے دروازے پر اب ایک پیتل کا بھاری بھرکم تالا لٹک رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بوڑھے بابا۔'' ڈرائیور نے اس سے پوچھا۔ ''ذرا گاڑی کا خیال رکھنا۔ میں پیشاب کر کے آتا ہوں۔ کوئی حرامزادہ دو بار ہمارا تالا توڑ چکا ہے۔''

ڈرائیور کے چلے جانے کے بعد وہ چپ چاپ کتوں کے سامنے کھڑا رہا۔ وہ آج تالا توڑنے والا اوزار لے کر نہیں نکلا تھا۔ مگر اسے ساتھ لے بھی آتا تو کیا کر پاتا۔ آج تو اسے الٹا ان کتوں کی پہرے داری سونپی گئی تھی۔

''میں کیا کر سکتا ہوں۔'' اس نے کتوں کے سامنے اپنی لاچارگی ظاہر کی اور ڈرائیور کو واپس لوٹتے دیکھ کر اس کا انتظار کئے بغیر ساحل کی طرف بڑھ گیا۔ یہ چھٹی کا دن تھا۔ آج ساحل پر سیاحوں کی بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا سمندر کے کنارے سمٹ آئی ہو۔ آج بہت سارے سفید فام بھی نظر آرہے تھے جو پانی سے الگ تھلگ چل رہے تھے۔ شاید انھیں اس جگہ سمندر کی غلاظت راس نہیں آرہی تھی۔

ایک جگہ اس نے کتا پکڑنے والوں کو دیکھا مگر انھیں نظر انداز کر دیا۔ واپسی پر اسی جگہ اسے کافی افراتفری نظر آئی۔ لوگ شور مچاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، ہنس رہے تھے، ایک دوسرے کے پیچھے چھپ رہے تھے۔ طوطے کی چونچ' ٹاٹ کے تھیلے کا منھ کھول کر ایک کتے کا پیچھا کر رہا تھا جو گیلی ریت پر اپنی تین ٹانگ کے سبب ایک طرف جھکا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ طئے شدہ منصوبے کے تحت دوسری طرف سے دریائی گھوڑا نمودار ہوا۔ اس نے اپنا شکنجہ کھولا اور کتے کی پیٹھ کے اوپر سے ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ کتا اتنا فاقہ زدہ اور لاغر ہو رہا تھا کہ اس نے آسانی سے اسے ہوا میں اٹھا لیا تھا۔ کتا شکنجے میں قید کیڑے کی طرح کلبلا رہا تھا، سر پٹک رہا تھا، اپنی ٹانگیں پھینک رہا تھا۔ وہ اس طرح چلا رہا تھا جیسے کوئی بوڑھی عورت بین کر رہی ہو۔ لوگ منھ کھولے اس تماشے کو

دیکھ رہے تھے۔

دوسری صبح اسے اپنے اوزار کے ساتھ نکلتے دیکھ کر کوچما اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔

''اس عمر میں تم کون سا جوکھم مول لینا چاہتے ہو؟''

''گھبراؤ مت کوچما۔'' اس نے کہا۔ ''میں بوڑھا ہوگیا ہوں تو کیا، اب بھی ایک چتر انسان ہوں۔''

اس دن کتا گاڑی میں ضرورت سے زیادہ کتے بھرے پڑے تھے جس کے سامنے 'طوطے کی چونچ'، 'دریائی گھوڑا' اور ڈرائیور کھڑے ایک چائے والے سے چائے پی رہے تھے جس نے اپنے تانبے کی ہانڈی کو ریت پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی ٹونٹی سے الہ دین کے چراغ کی طرح دھواں نکل رہا تھا۔ اسے گاڑی کے سامنے سے گذرتے دیکھ کر تینوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پلٹے واپس لوٹ رہا تھا جب اس نے کتا گاڑی کو تنہا کھڑا پایا۔ اندر تمام کتے دبکے پڑے تھے۔ باہر کوئی نہ تھا۔ اس نے دور تک ساحل پر نظر دوڑائی۔ اسے کہیں پر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ شاید وہ اپنے مشن پر بہت دور نکل گئے تھے۔ وہ اوزار نکال کر تالا پر زور لگانے لگا۔ تالا کافی مضبوط تھا، ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گاڑی پہیوں پر ڈول رہی تھی۔ کتے شور مچا رہے تھے، ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ اسے پتہ بھی نہ چلا جانے کب کتوں کے شور میں انسانی ہنسی کی آواز شامل ہوگئی تھی۔ اسے جب اس کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ کتا پکڑنے والے ڈرائیور کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر کمر پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ وہ اپنے اوزار کو اسی طرح اٹھائے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

''تو یہ ہے بڈھا شیطان۔ اور ہم کیا کیا سوچ رہے تھے۔'' 'طوطے کی چونچ' نے کہا اور تینوں اس کی طرف بڑھنے لگے۔

''دور رہو، دور رہو۔'' پلّے نے اپنے اوزار کو ہوا میں لہرانے کی کوشش کی جسے ڈرائیور نے بڑھ کر اس کے کمزور ہاتھوں سے چھین لیا۔'طوطے کی چونچ' نے ڈرایور کی مدد سے اسے ڈھکیل کر گاڑی سے اس کی پیٹھ لگا دی اور'دریائی گھوڑے' نے بھرپور مہارت کے ساتھ اپنے شکنجے کی مدد سے پلّے کو جالی کے ساتھ جکڑ لیا۔ پلّے کے پاؤں کانپ رہے تھے، پیٹ پر شکنجے کے دباؤ کے سبب وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ عینک کے اندر اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔

''کیسا لگ رہا ہے بوڑھے لنگور۔'' 'طوطے کی چونچ' اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ وہ تینوں اسے گھیرے کھڑے تھے جیسے وہ ان کے شکنجے میں آیا ہوا ایک اور کتا ہو۔ پلّے کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ طوطے کی چونچ نے جھک کر اس کا کرتا اوپر اٹھایا اور پتلون کے بٹن کھول کر زپ نیچے کھینچ دی۔

''مت۔۔۔نہیں۔۔۔سنو۔۔۔رکو، ایسا نہ کرو۔'' پلّے نے چیخنے کی کوشش کی مگر دریائی گھوڑے نے شکنجے کو کچھ اور کس دیا اور اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی پتلون گھٹنوں سے نیچے گر چکی تھی اور 'طوطے کی چونچ' اس کا انڈرویر نیچے سرکا رہا تھا۔

''کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔'' ڈرائیور نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ذرا خصیے تو دیکھو۔ اتنے بھاری خصیے کتے خوب پسند کرینگے۔''

''اپنا منھ بند رکھو۔'' 'طوطے کی چونچ' نے کہا۔ ''پہلے دیکھ تو لیں یہ واقعی اب کام کا رہ گیا ہے کہ نہیں۔'' اور وہ پلّے کی مشت زنی میں مصروف ہو گیا۔

پلّے کی آنکھیں جل رہی تھیں، وہ لوگوں کو مدد کے لیے بلانا چاہ رہا تھا مگر اس کی آواز کھو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کا سارا منظر جیسے پانی کے اندر تیر رہا تھا، صرف تھوڑا بہت وہ 'دریائی گھوڑے' کو اس کی ڈیل ڈول کے سبب دیکھ پا رہا تھا جو دونوں ہاتھوں سے شکنجے کو مضبوطی سے تھامے کھڑا اپنا اپنے بھاری بھرکم جبڑوں

سے چیونگم چبار ہا تھا۔ اسے یاد نہیں کتنا وقت گذر گیا۔ کتے لوہے کی جالی سے اپنے پنجوں کے ناخن نکال نکال کر اس کی پیٹھ کھرچ رہے تھے، اپنی رال ٹپکاتی زبان سے اس کی گردن کو چاٹ رہے تھے، شور مچا رہے تھے۔ اس کی پتلون زمین پر گری ہوئی تھی۔ طوطے کی چونچ اپنا کام کرتے ہوئے لگاتار اس کے خصیوں کو دبائے جا رہا تھا جس سے درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں اس کے پیٹ کی شریانوں کے اندر دوڑ رہی تھیں۔ جانے کب اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

اسے ہوش آیا تو کچھ گندے بچے اپنی ناک کے اندر انگلیاں ڈالے تھوڑے فاصلے پر کھڑے اسے تاک رہے تھے۔ کتا گاڑی جا چکی تھی۔ پتلون کو ہاتھ سے کمر کے اوپر کھینچتے ہوئے اس نے دیکھا، دور سمندر ابل رہا تھا اور اس کی عینک سامنے ریت پر گری ہوئی چمک رہی تھی جیسے کسی مدفون انسان کا سر ریت سے باہر نکلا ہوا ہو۔

○ ○ ○

پلّے ٹیرس پر بیٹھا دور اس جگہ تاک رہا تھا جہاں سمندر آسمان سے مل گیا تھا۔ وہاں مچھیروں کی کشتیاں پانی پر بچھی سورج کی کرنوں کے بیچ کھلونوں کی طرح ڈول رہی تھیں۔ کوچما گرم پانی میں تولیا ڈال کر اس کے بدن کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔

''کل سے تم کچھ سوچ رہے ہو مگر بتانا نہیں چاہتے۔'' وہ بولی۔

''ایسا کچھ نہیں کوچما۔'' اس نے اسے کتا گاڑی والا واقعہ نہیں بتایا تھا۔ مگر وہ چاہ رہا تھا کہ اسے دکھائے کہ انسان اور کتے میں کیا فرق ہوتا ہے۔

دوسری صبح اس نے کوچما سے پانچ سو روپے مانگے۔

''کس لیے؟''

''پہلے تو تم کبھی نہیں پوچھتی تھی کوچما؟''

''پہلے کبھی میں نے تمھیں اتنا چپ بھی نہیں دیکھا تھا۔''
''مجھے روپیۓ دے دو۔ میں تمھیں بعد میں سب بتادونگا۔''

○ ○ ○

ساحل پر گھومنے والوں کی بھیڑ اپنی جگہ پر تھی جب دونوں کتا پکڑنے والے دونوں طرف سے نمودار ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح وہ ایک لنڈورے کتے کو نشانہ بنا رہے تھے جو موج سے بہا کر لائے ہوئے ایک سڑے گلے ناریل کے کھوکھلے میں منھ ڈال کر اندر کسی کیڑے کو کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے
کہ دونوں اس کے قریب پہنچ پاتے بوڑھا پلّے گویا چھلاوے کی طرح کہیں سے نمودار ہوا اور اس نے پھرتی سے کتے کے گلے میں ایک پٹہ ڈال کر اس کی زنجیر تھام لی۔ کتا پکڑنے والے شکنجے اٹھائے اسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔
''یہ میرا پالتو کتا ہے۔ Don't touch it'' پلّے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ کتے کو پٹے کی عادت نہ تھی۔ وہ اسے چھڑا کر بھاگنا چاہ رہا تھا مگر پلّے نے اسے سختی سے تھام رکھا تھا۔ جانے اس کے اندر اتنی طاقت کہاں سے عود کر آئی تھی۔ اس کی تھیلی کے اندر ابھی ایک کم درجن بھر پٹے محفوظ تھے۔
لوگ بھیڑ لگا کر اس عجیب وغریب تماشہ کو دیکھ رہے تھے۔
''بڈھے۔ کہیں کتے نے کاٹ لیا تو چودہ انجکشن کے لالے پڑ جائینگے۔ ارے تم پاگل بھی ہو سکتے ہو۔'' 'طوطے کی چونچ' نے شکنجے سے کتے کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے ہمیں دے دو۔''
''بالکل نہیں۔ اور مجھے کتوں کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔ انسان کتوں سے زیادہ زہریلے ہوتے ہیں۔'' پلّے کتے کو گھسیٹتے ہوئے بولا۔ ''کتے کا کاٹا تو بچ

جاتا۔ انسان کا کاٹا کہیں کا نہیں رہتا۔"

لوگ چپ چاپ کھڑے اس عجیب وغریب انسان کو دیکھ رہے تھے جو ایک ادھ مرے کتے کو ریت پر گھسیٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کتا تھوڑی دور تک احتجاج کرتا رہا، پھر اس نے سپر ڈال دی اور پلّے کا دیا ہوا بسکٹ چباتے ہوئے کٹی ہوئی دم کو ہلاتے ہوئے چلنے لگا۔ اس دن پلّے نے تین اور کتے پکڑے اور جب چاروں کتوں کے ساتھ اپنے گھر کے پھاٹک پر نمودار ہوا تو کوچما نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔

"تم ان کتوں کا کیا کرو گے؟"

"انہیں گھر پر رکھوں گا۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔ اتنے سارے کتے، وہ بھی بیمار اور خارش زدہ جو کبھی بھی مر سکتے ہیں۔"

"مرنا ہوگا تو مر جائیں گے۔ تم مت گھبراؤ، میں انہیں ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ اور کوچما، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہیں اب کتوں کی عادت ڈالنی ہوگی کیونکہ ابھی اور بھی بہت سارے کتے آنے والے ہیں۔"

ایک ہفتے کے اندر اندر کوچما کا گھر کتوں سے بھر گیا۔ ان میں سے زیادہ تر کتے خارش زدہ اور گھاؤ سے بھرے ہوئے تھے مگر کچھ صحت مند کتے بھی تھے جو زیادہ آفت ڈھا رہے تھے کیونکہ وہ رات رات بھر چلایا کرتے۔ وہ آزاد کتے تھے، انہیں یہ قید پسند نہیں تھی۔

کوچما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کتوں کی تعداد میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ انہیں کھلانے اور گھر کو ان سے صاف رکھنے میں نوکرانی کا دم نکلا جا رہا تھا، وہ کام چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے رہے تھے۔ جانوروں کے ڈاکٹر نے تو گویا اس گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ آخر کار ایک دن اس نے جھنجھلا کر کہا۔

''آخر اتنے سارے کتوں کے ساتھ کب تک ہمیں رہنا ہوگا۔ اب تو پڑوس کے لوگ بھی شکایت کرنے لگے ہیں۔''

''گھبراؤ مت کوچما، ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

شاید پلّے ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب کتے پکڑنے والے کم کتے پکڑ پا رہے تھے۔ اس لیے نہیں کہ پلّے ان کا حصہ دار ہو گیا تھا گرچہ پلّے ان کے مقابلے اپنے بسکٹ اور مثبت ارادے کے سبب زیادہ کتا پکڑنے کا اہل ہو گیا تھا۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اب زیادہ تر کتے کتا گاڑی اور کتا پکڑنے والوں کو پہچان گئے تھے اور انھیں دیکھتے ہی ساحل سے غائب ہو جاتے۔ آخر کار ایک دن کتا گاڑی کا آنا بند ہو گیا۔

''پچھلے چار دن سے کتا گاڑی ساحل پر نہیں آ رہی ہے۔'' پلّے نے کوچما سے کہا۔ ''لگتا ہے اب وہ نہیں آئیں گے۔ میں ایک ہفتہ اور دیکھوں گا، پھر یہ کتے آزاد ہو جائیں گے۔ تم دیکھ رہی ہو میں نے دو دن سے ایک بھی کتا نہیں لایا۔''

''اب اور کتے کے لیے گھر میں جگہ کہاں؟''

''اس کتے کے لیے تو ہے۔'' پلّے نے کوچما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی تم وفادار ہو کتوں کی طرح؟'' کوچما کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔

''بالکل، صرف میرے پاس دم نہیں کہ ہلا کر دکھا سکوں۔''

○ ○ ○

سارے کتے گردنوں میں پٹا ڈال کر آزاد کر دیے گئے ہیں۔ راما نجن پلّے ساحل پر گھومتا ہے تو ان میں سے کچھ کتے اسے پہچان لیتے ہیں اور اس کا تعاقب کرنے لگتے ہیں۔ ان میں کچھ کو اس نے نام بھی دے ڈالے تھے جنھیں اب وہ گڈ مڈ کرنے لگا ہے۔

کتے اب بلا جھجک اس کے پاس آجاتے ہیں اور دم ہلاتے رہتے ہیں۔

''یہ دنیا تم لوگوں کے سبب ایک خوبصورت جگہ ہے۔'' پلّے ان کی گردن سہلاتے ہوئے کہتا ہے۔ وہ ہر روز سمندر کے کنارے سیر کے لیے نکلتا ہے۔ موجیں اچھلتی رہتی ہیں۔ اب کوئی کتا گاڑی ساحل پر نہیں آتی۔

○ ○ ○

سات پُلوں والا شہر

مجھے خبر ملی تھی کہ میرے دور کے ایک رشتے دار، جن کی ایک بڑے شہر میں اچھی خاصی جائداد تھی، بے اولاد مرنے والے تھے اور انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ اپنا سارا کاروبار، ساری جائداد میرے نام کر دینگے بشرطیکہ میں صحیح وقت پر ان کے روبرو جا کر اپنے آپ کو پیش کروں اور اتنی بڑی جائداد کے وارث کے طور پر ان کی زندگی کی آخری خواہش پوری کر دوں۔

اردو میں ایم اے کرنے کے بعد میں بیکار مارا مارا پھر رہا تھا۔ صحیح طور پر دیکھا جائے تو یا تو میں اپنی زندگی جی چکا تھا یا دوسرے معنوں میں ابھی میں نے اسے جینا شروع ہی نہیں کیا تھا۔ دراصل زندگی کا غیر جانبداری کے ساتھ محاسبہ کیا جائے تو آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہونگے کہ ان دونوں میں بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ میں عارضی طور پر اپنی کتابوں کی دنیا سے نکل آیا تھا۔ میں نے اپنے داہنے کان میں چاندی کی ایک بالی لٹکالی تھی کیونکہ اس سے کہیں پر کچھ بھی فرق پڑنے والا نہ تھا، اور یہ سوچ کر کہ وہ جو آسمان پر بیٹھا ہے شاید میری تخلیق کی غلطی سے نالاں ہو، میں نے دوسری طرح کی خرافات میں ملوث ہو کر (جن میں ایک تبلیغی جماعت میں شرکت کو لوگ بیکار جوڑ رہے تھے، جس کی مدد سے میں مشرقی بہار کے بہت سارے اضلاع ایک چھدام خرچ کیے بغیر گھوم آیا تھا) عشق کے سارے مواقع گنوا دیے تھے اور اب وہ ساری لڑکیاں جو کبھی

میرے بوسے کی حلاوت میں ڈوبنے کے لیے تیار بیٹھی تھیں، اپنے سے بہت زیادہ عمر کے بھاری بھرکم شوہروں کے ذریعے بچوں کی ماں بننے کے بعد ناقابل قبول ہو چکی تھیں۔

یہ اطلاع مجھے ایک لمبوترے چہرے والے شخص نے دی تھی جس کے دانت گھوڑوں کی طرح روشن تھے۔ وہ میرے دور کے رشتے دار کے پاس سے ہو آئے تھے۔ وہ خود کسی نہ کسی طرح سے ہمارے رشتے دار تھے اور اس اطلاع کے فوراً بعد انھوں نے اپنا بوریا بستر مستقل طور پر ہمارے گھر منتقل کرلیا تھا۔ ''تاکہ میں پوری طرح تمھارے کام آسکوں۔'' انھوں نے کہا۔

میں نے اس سے پہلے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خود میرے گھر کے لوگوں نے قدرے شک وشبہ کے ساتھ جھجکتے ہوئے انھیں قبول کیا تھا۔ وہ اپنی یادداشت کے کسی دھندلے گوشے میں ان کا ہیولا دیکھ تو پارہے تھے مگر اس دھند سے اسے نکالنے سے قاصر تھے۔

''کچھ تو معاملہ ہے، ورنہ یہ کہیں سے وارد کیوں ہوتا؟'' میرے ماموں نے جو مجھ سے سات سال بڑے تھے مگر بضد تھے کہ وہ میری ہی عمر کے ہیں کہا۔ وہ ہمارے ساتھ رہتے تھے اور اپنے نکمے پن کی زندگی پر ایک دائمی مہر لگا چکے تھے۔ ماموں کی شادی بہت کم عمر میں کر دی گئی تھی، مگر چار برس ایک بالکل ہی کمسن لڑکی کے ساتھ گذارنے کے بعد جس کی بڑی خوبصورت مہین موچھیں تھیں، اچانک انھیں احساس ہوا تھا کہ زندگی میں انصاف نام کی ایک چیز بھی ہے۔

''میں نے اسے دو گواہوں کے سامنے طلاق دیا اور سارے ساز وسامان کے ساتھ اس کی ماں کے گھر پہنچا دیا۔'' انھوں نے ایک دن اچانک بڑبڑاتے ہوئے اپنا سارا راز میرے سامنے اگل دیا تھا جب کہ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ شاید اس طرح وہ

ہمارے بیچ عمر کے فاصلے کو کم کرنا چاہتے تھے۔" میں نے اپنی ساس سے کہا: آپ ڈاکٹر سے جانچ کرالیں، وہ بالکل کنواری ہے۔'

'بھاڑ میں جاؤ تم اور تمھارا ڈاکٹر۔ میری ساس نے کہا اور میں نے چین کی ٹھنڈی سانس لی۔ جب کوئی تم سے کہے بھاڑ میں جاؤ، تو تمھیں اس بات کا اطمینان ہو جانا چاہیے کہ تم بھاڑ میں نہیں جاتے۔ پھر تم کہاں جاتے ہو؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"میں کہاں جاتا ہوں؟"

"تم بھاڑ میں نہیں جاتے۔ تم نئے سرے سے اپنا کمرا سجاتے ہو اور اپنی دونوں ہتھیلیاں سر کی پشت پر لے جا کر سوچتے ہو جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اب میں بیت الخلاء میں زیادہ دیر تک بیٹھ سکتا ہوں، نئے سرے سے اپنے دوستوں کی فہرست تیار کر سکتا ہوں، سورج اور چاند کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کر سکتا ہوں جو آخر میں ہو سکتا ہے نیا سفر ہی ثابت ہو۔"

میری بیکاری سے مجھ سے زیادہ میرے گھر والے پریشان تھے اور اس خوش خبری سے ان کا چونک جانا لازمی تھا۔ میری ماں، جو ایک تھکی ہوئی عورت تھی اور فیل پانے جسے ایک سست کیڑے میں بدل ڈالا تھا، میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تمھیں یہ سفر کرنا چاہیے، اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔"

"اور نہیں تو کیا۔" میرے زبردستی کے رشتے دار نے تائید میں اپنا بھاری سر ہلایا۔ "اگر تمھارے والد زندہ رہتے تو کیا وہ اپنی ساری مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اس شہر کا رخ نہ کرتے؟"

"اور کیا۔" میرے ماموں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "ایسے مواقع خوش نصیبوں کو ہی ملتے ہیں۔" پھر انھیں اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا اور انھوں نے اس کے تدارک کے طور پر کہا۔ "رکو رکو، یہ تو پورا معاملہ ہی انسانیت کا ہے۔ ہم کسی دوسرے نقطۂ نظر کا استعمال

کیوں کریں۔"

آخر کار تھک کر میں نے حامی بھر لی اور اس بات پر راضی ہو گیا کہ میں وہ شہر جا کر خود کو اپنے امیر رشتہ دار کے سامنے پیش کر دوں۔

○ ○ ○

اس شہر میں جانے کے لیے میں جس ٹرین میں بیٹھا تھا اس میں میرے داہنے بائیں دو اور مسافر بھی بیٹھے تھے اور وہ تھے ہمارے جبریہ رشتے دار اور میرے 'ہم عمر' ماموں اور دونوں اپنے نکلتے ہوئے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے سر کے اوپر سے ایک دوسرے کے
ساتھ ایک سازش بھری مسکراہٹ کا تبادلہ کر رہے تھے۔

○ ○ ○

یہ دو فیٹ اونچا ایک الو تھا جسے ایک مزدور نے ریلوے لائن کے کنارے اپنی کھولی میں پال رکھا تھا۔ محکمہ جنگلات کے اہلکار پولس کی مدد سے اس الو کو اس مزدور کے قبضے سے برآمد کر رہے تھے جب ریلوے ٹریک سے گذرتے ہوئے ہم مسافروں نے اپنے اپنے ڈبے کی کھڑکیوں سے اس منظر کو دیکھا۔ متجسس لوگوں کی بھیڑ کے سبب جو دونوں کناروں کی غلیظ بستیوں سے لوہے کی پٹریوں پر امنڈ آئی تھی ٹرین گھونگے کی رفتار سے چل رہی تھی اور بیچ بیچ میں دیر تک رک جاتی۔

"ارے اس رفتار سے تو ہم کبھی اپنی منزل تک پہنچ نہیں سکینگے۔" میرے جبریہ رشتے دار نے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"اور ہو سکتا ہے ملک الموت تب تک اپنا کام کر کے نکل چکا ہو۔" ماموں نے ہاتھ

ملتے ہوئے کہا جیسے انھیں ابھی سے موقع کے رائگاں چلے جانے کا یقین ہو۔

''یہ ایک الو کا معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمھیں کیسے پتہ؟'' میرے ماموں نے ناک پر اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا کیونکہ اونگھتے ہوئے انھوں نے یہ منظر کھو دیا تھا۔

''میں نے وہ الو دیکھا ہے۔ اسے ایک سپاہی پکڑے ہوئے تھا۔ الو کم از کم دو فیٹ اونچا ہوگا۔''

''یہ ایک اچھا شگن ہے۔'' میرے جبریہ رشتہ دار نے کہا اور اپنی لانبی ٹانگیں سامنے کی سیٹ کے نیچے اندر تک پھیلا دیں جہاں کنجڑوں نے اپنے سبزی کے بورے ٹھونس رکھے تھے جن سے پانی رستا ہوا فرش کو گیلا کر رہا تھا۔ اس سیٹ پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا سر لکڑی کی دیوار سے ٹکائے سو رہا تھا۔ اس کا پوپلا منھ کھلا ہوا تھا اور مجھے اس کے منھ کے اندر کا حصہ کسی سرنگ کی طرح نظر آرہا تھا جس میں اس کے حلق کے کوّے کو لٹکتے ہوئے صاف دیکھا جا سکتا تھا۔'' الو اپنا سر آگے پیچھے پورے ایک سو اسی ڈگری تک موڑ سکتے ہیں جو انسانوں کے لیے ناممکن ہے۔ اس لیے انھیں انسانوں کے مقابلے میں اگلے پچھلے کا زیادہ پتہ ہوتا ہے۔'' میرے جبریہ رشتے دار نے اپنی بات مکمل کی اور آنکھیں بند کرلیں۔

ٹرین قصبے سے نکل کر سرخ مٹی کی زمین پر دوڑ رہی تھی جہاں کے درختوں کے پتے سوکھ کر بے رنگ ہو چکے تھے۔ ہمارے سامنے کی کھڑکی کی سلاخوں پر پان کی پیک اور بلغم کے نشانات تھے اور ٹرین نے اس پر خود اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ میں دور کھیتوں میں کھڑی ان چمنیوں کو تاک رہا تھا جن کے نیچے مزدور اینٹیں پکانے میں مصروف تھے اور سوچ رہا تھا، اگر الو کا مقصد ٹرین کی رفتار کو سست روی میں بدلنا تھا تو اس کا کچھ بھی مطلب نکل سکتا ہے۔ پھر میں نے الو کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور اس

دور کے رشتے دار کے بارے میں سوچنے لگا جس کی ساری جائداد کا مالک میں بننے والا تھا۔ وہ کیسا ہوگا؟ کس رنگ کا ہوگا؟ اس کا قد کیا ہوگا؟ کہیں اس کے دماغ کی چولیں ہل تو نہیں گئی ہوں گی؟ اور پھر عین وقت پر اسے میرا چہرا پسند نہ آئے تو؟ کیا وہ تعلیم یافتہ ہے؟ بہت مذہبی ہے؟ دہشت گردوں کا حمایتی ہے؟ یا اسے سرے سے خدا کے وجود سے انکار ہے۔ امکانات تھے کہ چاروں طرف سے امنڈے چلے آرہے تھے اور میں ان کے حملوں سے خود کو بچانے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ آخر کار میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس دور کے رشتے دار کو اپنے ذہن سے باہر نکال پھینکا۔

یہ پہلا برا کام تھا جو میں نے اس سفر میں کیا۔ اور جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میرے اس عمل سے میرے اور اس دور کے رشتے دار کے درمیان اچانک ایک گہری خلیج حائل ہوگئی ہو۔ میں نے کھڑکی سے آنکھیں ہٹاتے ہی خود کو ماموں کی تیز نظروں کی گرفت میں پایا۔

''تم کچھ سوچ رہے ہو؟'' انھوں نے مشتبہ انداز میں میری طرف تاکتے ہوئے پوچھا۔

''میں سوچ رہا تھا اگر کولمبس کا جہاز نہ بھٹک کر ہندوستان آگیا ہوتا جہاں کے لیے وہ نکلا تھا تو کیا آج امریکہ کا وجود ہوتا یا آج دنیا کا نقشہ کچھ اور رہوتا؟'' میں اس طرح کے جھوٹ کے لیے کافی شہرت رکھتا تھا۔

''ہوتا وہی جو تم آج دیکھ رہے ہو۔'' ماموں نے مسکرا کر کہا۔ وہ ایک سچے مسلمان کی طرح تاریخ کو اپنے ڈھنگ سے پڑھنے میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ ''یورپ کے باشندوں نے عربوں سے جہاز رانی کا سارا علم حاصل کر لینے کے بعد بازی مار لی تھی۔ انھیں دیر سویر ہر جگہ پہنچنا ہی تھا چاہے وہ امریکہ ہو آسٹریلیا ہو، نیوزی لینڈ یا دونوں قطب۔''

''ہاں اور آج جب کہ زمین کا چپا چپا چھانا جا چکا ہے، وہ اب ہمارے سیارے سے

باہر کسی دوسرے سیارے کی تلاش میں نکل پڑے ہیں اور باقی دنیا صرف سیٹیلائٹ کے ذریعے بھیجی گئی ان کی تصویریں دیکھنے میں مصروف ہے۔" میں نے جواب دیا۔" لیکن میں سوچ رہا ہوں، ہو سکتا ہے ہمارا سفر بھی کولمبس کا سفر ثابت ہو۔ ہم جس مقصد سے نکلے ہوں اس کے بجائے ہمیں کچھ اور مل جائے۔ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے، میرے کسی دور کے رشتے دار کا وجود نہیں۔"

"ایسا نہ کہو۔" میرے جبریہ رشتہ دار نے نیند سے جاگتے ہوئے کہا۔ شاید وہ دونوں آنکھیں بند کیے ہماری باتیں سن رہے تھے۔" میں نے اسے اپنی ان ہی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ ایک دھان پان قسم کا کم گو آدمی ہے جسے تم اس شہر کے قدیم باشندوں میں شمار کر سکتے ہو، اور اس شہر میں ایک گہری ندی بہتی ہے جس کے پانی کا رنگ تمھیں حیران کر سکتا ہے۔ اور اس ندی پر سات پل بنے ہیں جن میں سے کسی پر بھی کھڑے ہو کر اس کی حویلی اور اس کے باغات دیکھے جا سکتے ہیں گرچہ ان میں زیادہ تر پل ڈھ کر پانی کے اندر جا چکے ہیں۔ میں نے کن ذرائع سے یہ معلومات حاصل کیں یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔"

"شاید آپ نے کسی شیروانی پہنے ہوئے پھکڑ شاعر کا ذکر کیا تھا جس نے مشاعروں کے چکر میں اپنا گھر برباد کر لیا تھا اور اپنے بال بچوں کو در بدر بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔" اور آپ نے شاید ایک بونے جواری کا ذکر بھی کیا تھا جو پتے بدلنے میں ماہر تھا۔ ہم کہاں تک ان لوگوں پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟"

"میری خبر پکی ہے۔" میرے جبریہ رشتے دار نے اعتماد کے ساتھ کہا۔" یہ دنیا اچھے اور برے دونوں طرح کے لوگوں سے بنی ہے، ہمیں ہر کسی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہمیں صرف اپنے کام سے مطلب ہونا چاہیے۔ اور میری زندگی کا تجربہ بتاتا ہے اچھے لوگ کسی کام کے نہیں ہوتے۔ وہ تمھیں صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ جنت کیسے جایا جائے۔

اس جہنم میں جہاں ہم اتارے گئے ہیں، جینے کا کیا طریقہ ہے وہ اس سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ اور پھر ہم افواہوں پر کان کیوں دھریں۔ ہوسکتا ہے جسے تم پھکڑ شاعر کہہ کر رد کررہے ہو وہ واقعی ایک بلند پائے کا دانشور نکل آئے اور وہ جسے جوئے کی لت ہے، ہو سکتا ہے جوئے کی میز سے باہر وہ ایک اچھا انسان ہو اور اس کے پڑوسی اس کا احترام کرتے ہوں، ممکن ہے اس نے اپنی ایک کڈنی دے کر کسی انسان کی جان بچائی ہو یا حکومتِ وقت کو اپنی دونوں آنکھوں کا وعدہ کیا ہو۔''

اب میرے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا کہ اس پورے معاملے سے دستبردار ہو کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دوں۔ ہوسکتا ہے کولمبس کی طرح میرا جہاز کسی ایسے ساحل سے ٹکرا جائے جہاں سے ایک نئے براعظم کی شروعات ہو، خوبصورت پہاڑوں، سرسبز چراگاہوں، برفاب دریاؤں اور نیلے آسمان سے اترتے رنگین پرندوں کی سرزمین جہاں جس حد تک آپ کی نظر جائے سب کچھ آپ کا ہو اور اس کے لیے آپ کو کسی کو ایک چھدام نہ دینا پڑے، نہ ہی خدا سے اس کی اجازت لینی پڑے۔

○ ○ ○

ٹرین ایک کافی بھیڑ بھاڑ والے اسٹیشن میں رکی تھی جس کے باہر رکشوں اور تانگوں کا ہجوم تھا۔ ان سے الگ کئی پرائیویٹ کاریں کھڑی تھیں جن کے ماڈل اب بننا بند ہو چکے تھے۔ اسٹیشن کے باہر کے رہائشی مکانات دھوپ اور دھول کے سبب اپنا رنگ و روغن کھو چکے تھے۔ لگتا تھا ان کے اندر رہنے والوں نے زندگی سے مایوس ہو کر ہر چیز کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اسٹیشن سے سو قدم دور ایک دقیانوسی پل کے اوپر ہم نے ایک تانگہ کی سواری لی جس کا دبلا پتلا کوچوان کرتا پاجامہ پہنے سر پر صافہ باندھے بیڑی پی رہا تھا۔ وہ جڑی ہوئی بھوؤں والا ایک بسیار گو آدمی تھا مگر اس کی

نوے فیصد باتیں اپنے گھوڑے سے ہوتیں جس کی پسلیاں صاف گنی جا سکتی تھیں۔ تانگہ پل سے گذر رہا تھا جب نیچے دریا کے مٹیالے پانی کی طرف تاکتے ہوئے میں حیران رہ گیا۔ اس تیزی سے بہتے پانی کا کوئی عجیب رنگ نہ تھا جس کا ذکر ہمارے جبریہ رشتے دار نے کیا تھا۔ یہ تو خود ہمارے شہر کے دریا سے کچھ الگ نہ تھا۔ بلکہ دریا کے دونوں کنارے بھی ایک جیسے تھے، ریت اور کیچڑوں بھرے جہاں پر ناکارہ کشتیاں الٹی پڑی تھیں اور ننگ دھڑنگ بچے جھاڑیوں کے درمیان کھیل رہے تھے یا مچھیرے اپنے ڈونگوں پر کھڑے پانی پر جال پھیلا رہے تھے۔ اسی دوران کوچوان نے اپنا چابک ٹکتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ یہاں نئے ہو اور شیرا، تجھے تو نئے لوگوں کی عادت ہے، بلکہ بچہ مقامی لوگوں سے بدک اٹھتا ہے، رے میرا بچہ۔''

''گھوڑے کا دماغ اور کیا سوچ سکتا ہے۔'' میرے جبریہ رشتے دار نے تلخی سے کہا۔ اسے شروع سے ہی تانگہ والا پسند نہیں آیا تھا۔'' اور رہا سہا دماغ تو تمہارا چابک چاٹ چکا ہوگا یا تمہاری بک بک۔''

''اگر اس کے پاس دماغ ہوتا تو یہ گھوڑا کیوں بنتا۔'' کوچوان نے قہقہہ لگایا۔ ''کیوں شیرا، پھر تو سوٹ بوٹ پہنے، ٹائی لٹکائے عینک چڑھائے، پان کی ڈبیا تھامے تانگے پر سوار ہوتا اپنا بچہ اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے، چٹکی سے راکھ جھاڑتے ہوئے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے مزے لیتا۔''

میرے جبریہ رشتے دار کا گھوڑا نما منھ کھل گیا تھا۔ شاید اسے جواب کے لیے مناسب الفاظ مل نہیں رہے تھے، یا اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش میں الفاظ اس کے منھ سے ادا ہونے سے قاصر تھے۔ آخر کار اس نے زبان سے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔ ''گھوڑے کو قابو میں رکھو۔ کیسے بے تکے چشمے تم نے اس کی آنکھوں میں باندھ رکھے ہیں۔ کہیں لے دے کر دریا میں نہ کود پڑے۔ کنارے کی دیوار بالکل کمزور ہے۔''

جب کہ پل پر کئی ایسی جگہیں تھیں جہاں دونوں طرف کی دیواریں کب کی ڈھ چکی تھیں۔ ان کی جگہ اب صرف ایک آدھ ٹیڑھے میڑھے ستون قائم تھے جیسے وہ دریا میں چھلانگ لگانے کے بارے میں سوچ رہے ہوں۔

تانگے والا مسکرایا اور اس نے گھوڑے کے مٹکتے پٹھوں پر جو پسینے سے شرابور ہو رہے تھے، چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔ "بچہ، تو کب تک صبر کریگا بے۔ ایک دن تو دکھا ہی دے، دکھا دے ایک دن، لے دے کر دریا میں نکل لے، یہ بھی کیا کہ بس اس پار سے اس پار اور اس پار سے اس پار۔"

اور جب کہ گھوڑا سرپٹ پل پر دوڑ رہا تھا، ہمیں دوسرے کنارے میرے دور کے رشتے دار کا حویلی نما سفید مکان نظر آ گیا جس کی ندی کی طرف کی دیوار ٹیڑھی ہو کر زمیں بوس ہو گئی تھی اور اندر کے پیڑ پودے پرانے، روائتی اور دھندلے نظر آ رہے تھے جیسے کسی بچے نے مومی پنسل سے بڑے ہی بھونڈے انداز سے ان میں رنگ بھرا ہو۔

○ ○ ○

اس حویلی کا بابِ ہیکل جیسا بڑا سا پھاٹک تھا جس کے سر دل پر دو نگی شیر ایک دوسرے کی طرف رخ کئے معاندانہ انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کی دم ٹوٹ گئی تھی، دوسرے کے لہردار بالوں کے بیچ نین تارا کی ایک جھاڑی اگ آئی تھی جس میں کئی زرد رنگ کے کٹورے نما پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے یہ شیر میرے بارے میں سوچ رہے ہوں۔ پھاٹک اور حویلی کے بیچ ایک بنجر زمین پڑی تھی جو کبھی ایک باغ کی شکل میں رہی ہوگی۔ اس کے فوارے کا حوض سوکھا پڑا تھا۔ اس کے ایک سرے پر نیم مردہ پیڑوں میں اب بھی تھوڑی بہت ہریالی نظر آ رہی تھی۔ ان سے الگ تھلگ ایک بغیر پتوں والا پیڑ کھڑا تھا

جسے مرے برسوں ہو گئے تھے۔ اس کا تنا اور ننگی شاخیں دھوپ میں تپ کر تانبے کی طرح دمک رہی تھیں۔ ہماری آہٹ سے چونک کر ایک کٹھ کھدرے نے اس کے تنے کے ایک سوراخ سے چونچ باہر نکال کر ہماری طرف دیکھا، اس کا خوبصورت رنگوں سے مزین جسم پوری طرح باہر آیا اور وہ اڑتا ہوا دریا کی طرف چلا گیا۔

حویلی کے اونچے ستونوں کے باہر کھلے صحن پر ایک تیار میت رکھی تھی۔ کچھ سفید پوش ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ہوا میں لوبان اور اگربتی کی تیز خوشبو تیر رہی تھی۔ اندر کسی کمرے سے مدرسے کے بچوں کی قران خوانی کی بھنبھناہٹ ابھر رہی تھی۔ کبوتروں کو دانے دیے گئے تھے جنھیں وہ وسیع و عریض زینے پر چگ رہے تھے۔ مکان کے اندر کے کسی اندرونی پائپ سے گندا پانی رس رس کر زینے پر پھیل رہا تھا۔

''ہمیں دیر ہو گئی۔'' ماموں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

مجھے الو کا خیال آیا۔

''ممکن ہے ابھی اس کا وصیت نامہ کھولا نہ گیا ہو۔'' میرے جبریہ رشتہ دار نے کہا۔ وہ ہار ماننے والے شخص نہ تھے۔ ''ہمیں اس کے وکیل کا پتہ لگانا چاہیئے۔''

لوگ خاموشی سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے، سرگوشی میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک جگہ بھیڑ میں کھڑے ایک فرد نے ہماری طرف اشارا کیا۔

''لگتا ہے لوگوں کو ہماری آمد کی خبر ہو گئی ہے۔'' میرے جبریہ رشتے دار کا چہرا روشن ہو گیا۔ ''جانے کون یہاں کا انچارج ہے۔''

بہت جلد ہمیں پتہ چل گیا کہ وہاں ہمارا انتظار کسی کو نہ تھا۔ لوگ پہلے سے ساری چیزیں سنبھال چکے تھے، معاملہ قریبی رشتے داروں کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ اب ساری ہدایتیں وہی دے رہے تھے۔ وہ بے چہرا لوگ جو ہر جگہ موجود تھے۔

''ہمیں میت کو کاندھا دینا چاہیئے۔'' میرے جبریہ رشتے دار نے کہا۔ ''پھر ہم اس

کے وکیل کی تلاش میں نکلینگے۔ اسی دوران شاید اور بھی باتوں کا سراغ لگے۔"

میرے ماموں ایک آدمی سے گفتگو کرنے لگے۔ وہ بار بار میری طرف اشارا کر رہے تھے۔ سفید کرتا اور کافی گھیر والے پاجامہ میں ملبوس وہ شخص معاشی طور پر کافی ناآسودہ نظر آرہا تھا اور رک رک کر سر ہلا رہا تھا۔ اس نے ماموں سے ہاتھ ملایا اور واپس بھیڑ میں شامل ہوگیا۔

"میں نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔" ماموں نے قریب آ کر کہا۔ "لگتا ہے تمہاری خبر لوگوں کو پہلے سے تھی۔ تمہارا نام لوگ سرگوشیوں میں لے رہے ہیں۔"

ظہر کی نماز کے بعد جنازہ کاندھوں پر اٹھایا گیا اور میت حویلی کے پیچھے کی ڈھلواں زمین پر اتر کر ندی کی طرف جانے لگی جہاں اونچے پیڑوں کا جھنڈ تھا اور زمین خاردار جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ میرے دور کے رشتے دار کا خاندانی قبرستان تھا۔ جھاڑیوں کے درمیان جگہ جگہ قبریں دھنسی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ ترتیب سے ننھے منے بچوں کی قبریں بنی تھیں جن میں کچھ قبریں بالکل تازہ تھیں۔ وہاں سے حویلی کی منہدم شدہ چہار دیواری کے اوپر ندی کے مٹیالے پانی کو دیکھا جا سکتا تھا اور وہ ساتوں پل بھی نظر آرہے تھے جن میں سے ایک سے گذر کر ہم آئے تھے۔ میت ایک چبوترے پر رکھ دی گئی جو اسی مقصد سے بنایا گیا تھا اور لوگ آخری نماز کے لیے قطار باندھ کر اپنے جوتے چپل کھول کر نیم مردہ گھاس کے اوپر کھڑے ہو گئے۔ جبر یہ رشتے دار نے میرا داہنا بازو سختی سے تھام رکھا تھا اور اس کے سبب ہم پہلی قطار میں نمایاں جگہ پر کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے۔

پیش امام نے کفن کے کپڑے کی جائے نماز میت کے سامنے بچھائی اور مڑ کر اپنی مہندی سے سرخ داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا اجازت کا طلبگار ہوا۔

تمام سر میری طرف مڑ گئے۔

واقعات کے اچانک اس طرح موڑ لینے پر میرے ہم عمر ماموں اور میرے جبریہ رشتے دار کی باچھیں کھل گئیں۔

''اجازت دے دو بیٹا'' میرے جبریہ رشتے دار نے مجھ سے با آواز بلند کہا اور میں نے سر ہلا کر ہلکی آواز سے اجازت دے دی۔ نماز جنازہ کے بعد تدفین کا کام بہت ہی خاموشی کے ساتھ انجام پایا۔ پھر حویلی اور اس کے لان میں لوگ کم ہو گئے۔ ہمیں ایک کافی بڑا کمرا رہنے کو دیا گیا جس میں ایک غیر معمولی جسامت کے تختہ پوش پر چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر پڑے ہوئے دھبوں سے صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ کسی آرائش گر کی دکان سے منگائی گئی تھیں۔ کمرے کے اندر باقی کا حصہ بالکل خالی پڑا تھا، کہیں پر ایک کرسی بھی نہ تھی۔ دیواروں میں گہرے طاقچے بنے تھے جن کی پشت کی طرف کی دیوار تاریک تھی، کارنس پر پگھلے ہوئے موم کی لکیریں نظر آ رہی تھیں اور قد آدم کھڑکیوں میں چمکدار سفید بادل پھول رہے تھے۔ شاید ان کے پیچھے چاند روشن ہو چکا تھا۔

''خدا کا شکر ہے۔'' میرے ماما نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سارا کام بخیر وخوبی انجام پا گیا۔ تم اتنی بڑی حویلی کے وارث بن گئے۔''

رات کا کھانا سادا اور لذیذ تھا۔ شاید یہاں نوکر چاکر کے علاوہ جو رشتے دار تھے وہ اپنے فرض سے بخوبی واقف تھے۔ ایک ایسے ماحول کے پروردہ جہاں حفظانِ صحت کے اصولوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہو۔

○ ○ ○

وقت: اس کا احساس ہوتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے گھڑی کے کانٹے کسی گم شدہ منزل کی تلاش میں چکر لگا رہے ہوں۔

تیسرے دن جب ایک بڑی جائداد کا دعوی دار بن کر میں واپس اپنا شہر لوٹا

توٹرین میں میرے ماموں کے ساتھ میرے جبریہ رشتے دار کی لڑائی ہوگئی۔ الو کا واقعہ جہاں پیش آیا تھا شاید ہم اس جگہ سے گذر چکے تھے یا شاید ہم ابھی وہاں پہنچ نہیں پائے تھے۔ میرے ماموں جو کھڑکی سے باہر تاروں سے سفید آسمان کی طرف تاک رہے تھے انھوں نے میری طرف سر موڑے بغیر کہا۔

''یہ واقعہ اتنی جلد اور اتنے عجیب ڈھنگ سے اپنے پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے کہ مجھے اس پر شک ہونے لگا ہے کہ کیا وصیت نامے میں جس کا ذکر ہے وہ واقعی تم ہی ہو یا کوئی دوسرا آدمی ہے!''

''عجیب سوال ہے۔'' میرے جبریہ رشتے دار نے کہا۔ ''تم خوامخواہ بچے کو پریشان کر رہے ہو۔ کیا تم اس طرح اچانک اور بلا وجہ بدل جایا کرتے ہو؟ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم تمھارے بغیر اس مہم کے لیے نکلتے۔''

''کیسی مہم، تم خوامخواہ اس واقعے کو طول دے رہے ہو۔'' ماموں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اور تم اپنے بھگڑ شاعر اور دھوکے باز جواری کا واقعہ مت دہراؤ۔ تم جیسے لوگ مکڑی کی طرح چپ چاپ اپنا نہ نظر آنے والا جال پھیلاتے ہیں اور مکھی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔''

''کیا تمھارے ماما ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں؟'' میرے ماموں کے ٹائلٹ جانے کے بعد (بہت زیادہ جذباتی ہو جانے پر وہ ہمیشہ ٹائلٹ کا رخ کیا کرتے) میرے جبریہ رشتے دار نے مجھ سے پوچھا۔ ''اور میں اپنی پہلی فرصت میں اس شاعر اور اس تاش کے جوکر کو تمھاری خدمت میں پیش کر دونگا تاکہ تمھارے باقی کے شبہات بھی رفع ہو جائیں۔ یا پھر کون جانے، وہ خود تمھیں ڈھونڈ نکالیں، آخر کار تم ایک بڑی جائداد کے مالک بن بیٹھے ہو۔''

ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ ہمارے گھر کے لوگ اب تک اس جائداد کا ذکر کر رہے

تھے۔لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے پچھلے کچھ دنوں کے اندر جو کچھ بھی ہمارے ساتھ پیش آیا تھا،سفر،موت،انواع واقسام کے کاغذات پر دستخط اور واپسی کا سفر،تمام چیزیں ہر گذرنے والے اسٹیشن کے ساتھ اپنے معنی کھوتی جا رہی تھیں اور آخری پڑاؤ پر،اپنے شہر میں ٹرین سے باہر آ کر ہم لوگوں نے دیکھا،اس چھوٹے سے عرصے میں شہر اچانک کتنا بدل گیا تھا۔اس کے بجلی کے کھمبے جو برسوں سے تاریک پڑے تھے،روشنی دینے لگے تھے،اس کی سڑکوں کی ویرانی جا چکی تھی،انھیں عجیب وغریب لوگوں نے اپنے نرغے میں لے لیا تھا جنھیں میں اپنے شہر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔لڑکیاں رنگین چھتریاں اٹھائے گذر رہی تھیں اور دکان کے شوکیسوں میں سجے سامان اپنے اشتہارات کی بھونڈی تصویر نظر آرہے تھے۔آہ،میں نے سوچا،کیا واقعی دیکھتے دیکھتے یہ شہر اتنا بدل گیا تھا کہ ہم اسے پہچان نہیں پا رہے تھے یا ہم اپنے دور کے رشتے دار کے شہر سے نئی آنکھوں کے ساتھ واپس لوٹے تھے یا پہلی بار اس لائق ہوئے تھے کہ اپنے شہر کو سچ مچ دیکھ پائیں۔

گھر کے لوگوں نے اس حیرت انگیز واقعے کا اپنے انداز سے لطف لیا اور بظاہر اسے بھول گئے۔لیکن یہ ہماری نادانی تھی۔اگلے ہفتے گھر کے نصف درجن افراد دریا کے کنارے واقع اس حویلی کی تلاش میں نکل پڑے۔ماموں نے ان کا رہبر بننے سے انکار کر دیا تھا اور ہمارے جبریہ رشتے دار پر یرقان کا حملہ ہو چکا تھا۔

''بڑے پل سے پہلی چیز جو دریا پار دکھائی دے گی وہ وہی حویلی ہے۔''ہمارے جبریہ رشتے دار نے اپنے بستر علالت سے گھر کے افراد کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے دور کے رشتے دار فی الحال اس کی رکھوالی پر معمور ہیں۔مگر وصیت نامے سے ان کا دور دور تک کا واسطہ نہیں،اور عدالت سے وصیت نامے کی سند ملتے ہی ان لوگوں کا اس حویلی سے قبضہ ختم ہو جائے گا۔اس لیے اگر وہاں پہنچ کر آپ صرف دربان

اور ایک دونو کر چا کر دیکھیں تو اس میں حیرت زدہ ہونے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

گھر میں بہت کم افراد رہ گئے تھے۔ ماموں کو میں نے دو دن سے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہمارے جبریہ رشتے دار کی حالت بالکل بگڑ گئی اور انھیں سرکاری اسپتال لے جانا پڑا جہاں ڈاکٹروں نے فوراً پانی چڑھانے کا حکم دیا۔ ہماری طرف سے بہت کوششیں کی گئیں، مگر ان کی حالت بگڑتی گئی۔ رہا سہا کام سرکاری ڈاکٹروں کی غفلت نے پورا کر دیا۔ وصیت کے طور پر، مرنے سے قبل، ہمارے جبریہ رشتے دار نے اسپتال کے مہکتے ماحول میں اپنے داغدار بستر پر جو کچھ سرگوشی میں میرے کان میں کہا وہ تھا ''وہ پھکڑ شاعر اور تاش بدلنے والا جواری، تمھیں چاہیے کہ ان کی تلاش کرو۔ ان کے سامنے اپنی ممنونیت کا اظہار کرو۔ میری طبیعت سدھر جاتی تو میں تمھیں خود لے کر جاتا۔''

''کیا یہ ضروری ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ مجھ سے ان کا مرنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ مگر میں فوری طور پر ان کی کسی بھی بات پر رضامندی دینے کے حق میں نہ تھا۔

''اس کا فیصلہ تمھیں کرنا ہے۔''

ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ہمیں ان کے ٹھکانے یا کسی قریبی رشتے دار کا کچھ بھی علم نہ تھا اور ان کے جس نام سے ہم آشنا تھے اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ فرضی تھا کیونکہ انھوں نے اپنا نام دارا شکوہ بتایا تھا اور ہمیشہ اس بات پر اڑے رہتے کہ نام کاموفلاج کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتے جس کی آڑ میں انسان ایک محفوظ زندگی گذارنے کی اداکاری کرتا ہے جب کہ خود اس کے سبب آسانی سے دوسروں کی گرفت میں آجاتا ہے۔ صرف جانوروں کو اس کاموفلاج کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دارا شکوہ کو ہم نے نہ صرف شہر کے واحد قبرستان میں ایک اچھی جگہ دفن کیا جہاں ایک کوئل نفاست سے کوک رہی تھی بلکہ ان کے لیے ایک قیمتی لوح کا انتظام بھی کیا

گیا جس پر ان کا نام اور موت کی تاریخ کندہ تھی اور نیچے اردو میں لکھا تھا ''فرشتے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔''

دارا شکوہ کو مرے چھ ماہ ہو رہے تھے جب ایک دن میں سات پلوں والے شہر کی طرف جانے کے لیے بے چین ہو اٹھا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی تھی میں بتا نہیں سکتا مگر اچانک میرے اندر اس پھکڑ شاعر اور دھوکے باز جواری سے ملنے کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی جیسے قبر کے اندر سے دارا شکوہ مجھے اس کے لیے اکسا رہا ہو۔ ماموں نے اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ (اسی درمیان انھوں نے ایک عجیب سی خبطی داڑھی اگالی تھی اور پیر فقیروں کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ یہی نہیں، انھوں نے اپنی صحیح عمر بھی تسلیم کر لی تھی۔) انھوں نے اعلان کیا کہ میرا اس شہر میں ان حالات میں جانا ٹھیک نہیں، کہ مرحوم کے کچھ مشتبہ رشتے دار اب بھی اس حویلی میں اپنی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے اور نہ صرف یہ کہ بہت سارے مقدموں کی شروعات ہو چکی تھی بلکہ انجان گوشوں سے دھمکیوں کا نزول بھی ہونے لگا تھا۔

اور وقت گذرتا رہا۔

وقت: جس کا احساس ہوتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے گھڑی کے کانٹے بغیر کسی مقصد کے چکر لگا رہے ہوں۔

○ ○ ○

ملک کے سیاسی حالات اسی درمیان تیزی سے بدل رہے تھے۔ مجھے کالج میں ملازمت مل گئی تھی بلکہ ملے کئی سال ہو گئے تھے جب ایک دن سات پلوں والے شہر کے لیے میری پرانی بے چینی پھر سے لوٹ آئی۔ میں نے کسی کو اطلاع دیے بغیر سفری تھیلی میں سامان بھرے، اسے پیٹھ پر لادی اور سات پلوں والے شہر کے لیے نکل پڑا

جہاں میرا دور کا رشتہ دار میرے لیے مقدموں سے بھری ہوئی ایک جائداد چھوڑ گیا تھا۔

یہ سفر کے لیے اچھا موسم نہ تھا۔ مانسون کے لوٹتے بادلوں کے سبب آسمان کی روشنی دن ختم ہونے سے پہلے ہی بجھ گئی تھی۔ ٹرین کے ڈبوں میں اندرون ملک کی طرف سفر کرتے مسافروں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ ان میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو کٹائی کا موسم ختم ہونے پر اپنے وطن کی طرف مراجعت کر رہے تھے۔ مجھے کھڑکی سے تھوڑی دور جگہ ملی تھی۔ کھڑکی کے پاس ایک بوڑھا نابینا شخص بیٹھا تھا جو ٹرین کے چلتے ہی اپنا استخوانی سر میرے داہنے کندھے پر ڈال کر سو گیا۔

ایک لمبی نہ ختم ہونے والی تکلیف دہ غنودگی کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، رات گذر گئی تھی۔ مطلع صاف ہونے لگا تھا اور ٹیلی گراف کے کھمبوں پر بیٹھی چڑیوں کا ہرا رنگ صاف نظر آرہا تھا۔ ٹرین بہت ہی سست رفتاری کے ساتھ چل رہی تھی۔ نابینا رات کو ہی پچھلے کسی اسٹیشن میں اتر گیا تھا۔ بہت جلد ہمیں ٹرین کی سست روی کا سبب سمجھ میں آگیا۔ باہر پٹریوں پر کافی دور تک بڑے پیمانے پر مرمت کا کام چل رہا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ مزدور ہتھوڑے اور بیلچے اٹھائے کام کر رہے تھے۔ کہیں کہیں وہ بھیڑ کی شکل میں ایک آدھ جگہ کھڑے بھی تھے یا اپنے اوزار سنبھالے انجینیروں کا پٹریوں پر سے ہٹنے کا انتظار کر رہے تھے تا کہ وہ اپنے کام سے لگ سکیں۔

منزل پر پہنچ کر میں اسٹیشن سے باہر آیا تو مجھے کہیں پر کسی تانگے کا نام و نشان دکھائی نہ دیا۔ ان کی جگہ پل کے داخلے پر قطار سے آٹو رکشا کھڑی تھیں۔ نیچے دریا پہلے کے مقابلے میں زیادہ گندا نظر آرہا تھا۔ جانے اس کا وہ منفرد رنگ (جو پہلے بھی مجھے دکھائی نہیں دیا تھا) کہاں بہہ کر چلا گیا تھا۔ دریا پر بنے ہوئے دوسرے پل جن میں سے کچھ کے اب کنارے کے حصے ہی باقی بچے تھے ویران پڑے تھے یا کم و بیش اس بڑے پل سے ویران نظر آرہے تھے۔ ایک جگہ دریا کے دونوں کنارے بڑے بڑے

کرین کام کر رہے تھے۔ وہاں ایک پرانے پل کو توڑ کر نئے پل کے بنانے کا کام شروع ہو چکا تھا۔ میں ایک آٹو رکشا پر بیٹھا مسافروں کے بھرنے کا انتظار کر رہا تھا جب اچانک آسمان کا ایک گوشہ کھل گیا اور اس سے نہ نظر آنے والے سورج کی روشنی ایک دور افتادہ ادھورے پل پر گرنے لگی۔ اس پل پر ایک اسنیک برڈ اپنے پر پھیلائے کھڑی تھی اور نیچے دریا کی طرف تاک رہی تھی۔

آٹو رکشا کا سائلنسر خراب تھا، خود اس کے اندر بجتا ہوا ڈیک بہت ہی بھونڈا شور مچا رہا تھا جیسے اسے موسیقی سے خدا واسطے کا بیر ہو۔ اس شور کے سبب میں کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا۔

''تم اس کی مرمت کیوں نہیں کرواتے؟'' ایک مسافر نے کہا مگر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ آٹو کے سائلنسر کے بارے میں کہہ رہا تھا یا اس کا اشارا اس کے ساؤنڈ سسٹم کی طرف تھا۔

''یہ میری گاڑی نہیں۔'' ڈرائیور نے جو بدلتے فیشن کی مناسبت سے ایک غلیظ گولف کیپ سر پر پہنے ہوئے تھا ناخوشگواری کے ساتھ کہا۔ وہ ہم مسافروں کے ساتھ بہت ہی چڑچڑے پن سے پیش آ رہا تھا جیسے ہم اس کی مرضی کے خلاف پیدا ہو گئے ہوں۔ میری نظر دریا کے دوسرے کنارے سفید بادلوں کے نیچے ان کثیر منزلہ عمارتوں کی قطار کی طرف چلی گئی جن کا پچھلی بار کوئی وجود نہ تھا۔ شاید پوری دنیا کی طرح یہاں بھی تعمیر کا جنون شروع ہو چکا تھا۔

حویلی کا لوہے کا پھاٹک غائب تھا۔ اندر مویشی اور گدھے اینڈ رہے تھے۔ بارش رک رک کر اور بالکل دھیمی رفتار سے ہو رہی تھی۔ سفری تھیلی پیٹھ پر اٹھائے میں حویلی کے بند دروازوں اور دریچوں کے باہر کسی روح کی طرح منڈلاتا پھرا۔ قبرستان کا بہت سارا حصہ خودرو جھاڑیوں کے اندر غائب ہو چکا تھا۔ خود میرے دور کے رشتے دار

کی قبر دھنس گئی تھی۔ میں نے اس پر پڑے ہوئے کچھ گیلے پتے صاف کئے اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں حویلی کے باہری برامدے پر ستونوں کے بیچ کھڑا اس بے تکی بارش کی طرف تاک رہا تھا جب میں نے ایک گدھے کو پھاٹک سے اندر آتے دیکھا۔ وہ عین سیڑھی کے نیچے اپنے کان کی نوکیں ملا کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف تاکنے لگا جیسے میرے وجود کے معمے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اتنی دیر تک اس حالت میں کھڑا رہا کہ میں بارش کو بھول گیا۔ یاد آیا تو دیکھا بارش رک گئی تھی۔

میں نے اپنی سفری تھیلی کے سائڈ چین سے کاغذ کا ایک مڑا تڑا ٹکڑا برآمد کیا جس میں دونوں کے پتے نفیس اردو میں لکھے تھے، ساتھ ہی درگاہ کے قریب ایک ہوٹل کا بھی ذکر تھا، جہاں دونوں کے ملنے کا زیادہ امکان تھا۔ میں نے ایک آخری نظر حویلی پر ڈالی جو ایک تیزی سے سیاہ پڑتے آسمان کے نیچے کافی ویران اور دہشتناک نظر آ رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا واپس لوٹنے سے قبل ایک بار پھر اس جگہ آؤنگا۔ پھاٹک سے باہر آتے وقت میں نے دیکھا سر دل پر کھڑے دونوں سنگی شیر نصف سے زیادہ غائب ہو گئے تھے۔ ایک کے سامنے کے دونوں پیر اور سر اور دوسرے کا صرف پچھلا حصہ ہی باقی بچے تھے۔ ان کے ٹکڑے زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ ایک جگہ مجھے ایک کی ٹوٹی ہوئی دم نظر آئی جس پر پاؤں رکھتے ہی جانے کیوں میری ریڑھ کی ہڈی کے اندر ایک کپکپی دوڑ گئی۔

بارش شدت سے شروع ہو چکی تھی جب ایک آٹو رکشا پر بیٹھ کر میں نے دونوں پتے پر چھان بین شروع کی۔ کسی بھی محلے میں ان دونوں کے نام سے کسی کو بھی واقفیت نہ تھی۔ میری ٹرین رات دس بجے سے پہلے آنے والی نہ تھی۔ میں نے آٹو کو دریا کے کنارے تارکول کے راستے پر چھوڑ دیا اور تھیلی پیٹھ پر لاد کر چلنے لگا۔ بارش ایک گھنٹہ پہلے ہی رک گئی تھی اور گیلے شہر پر دھوپ اتر آنے کے سبب اس کی دیواریں اور

دریچے دھند سے ابھرنا شروع ہو گئے تھے جب میں نے دیکھا، افق تا افق پھیلے ہوئے ایک قوسِ قزح نے شہر کو دو نیم کر ڈالا تھا۔ سورج کے ڈوبنے میں اب تھوڑا سا ہی وقت رہ گیا تھا جب اس آخری پل کے کنارے، جس پر تعمیر کا کام چل رہا تھا، ایک درگاہ کے پھاٹک کے باہر جہاں قطار سے پھول والوں کی دکانیں تھیں پہلی بار مجھے دو تانگے کھڑے نظر آئے۔ اس جگہ سے تھوڑا ہٹ کر ہوٹل کی وہ قدیم عمارت نظر آ رہی تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس کی ایک طرف کی دیوار میں کہیں بھی کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی۔

ہوٹل کا رستوران کافی گندا تھا۔ اس کی دیواریں گہرے نیلے رنگ کی تھیں جو اندر کے اندھیرے کو اور بھی گہرا کر رہی تھیں۔ بلب کی روشنی میں کم عمر لڑکے تہبند پہنے پلیٹیں اور گلاس میزوں پر رکھ رہے تھے، انھیں وہاں سے ہٹا رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک کوتاہ قد آدمی جس کے چہرے پر ایک مسہ مکھی کی طرح بیٹھا ہوا تھا، اور جو کافی صحت مند تھا، میز پر بیٹھا تاش کے پتے سجا رہا تھا۔ اگر ہم تھوڑا سمجھوتہ کر لیں تو اسے بونا بھی کہا جا سکتا تھا۔

"کھیلو گے؟" مجھے اپنی طرف تاکتے دیکھ کر اس نے مخاطب کیا۔

"ہاں" میں نے سفری تھیلی میز پر رکھ دی اور اس کے اندر سے پانی کی بوتل نکال کر ایک گھونٹ لیا۔ وہ احتیاط سے پتے ملا رہا تھا، ان کی تقسیم کر رہا تھا۔ مجھے پتے کھیلنا نہیں آتا تھا۔ میں تینوں پتوں کو انگلیوں کے بیچ نچاتا رہا اور اسی کی رقم کے برابر رقم میز پر پھینکتا رہا اور بار بار جیتتا رہا۔ میں اس شخص کی منحنی انگلیوں پر نظر بھی رکھے ہوئے تھا۔ مگر اس نے پتے نہیں بدلے۔

اکتا کر میں نے اپنی بوتل سے پانی کا آخری گھونٹ لیا، سفری تھیلی کے بکلس پیٹھ پر کس لیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کھیلو گے نہیں؟ تم تو جیت رہے ہو، وہ کیا کہتے ہیں Beginner's luck۔''
''نہیں'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے کسی کی تلاش ہے۔''

باہر جانے سے پہلے میں نے اس کے سارے جیتے ہوئے پیسے لوٹا دیے تھے۔ شروع شروع میں اس نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر میرے بار بار اصرار کرنے پر جھجکتے ہوئے قبول کرلیا۔

اس دن میں ایک دوسرے ہوٹل میں ٹھہر گیا جس کے پیچھے گنا کے کھیتوں میں رات بھر ہوا سرسراتی رہی۔

میں دو دن تک اس شہر میں بھٹکتا رہا۔ میں نے شہر کے تقریباً تمام محلے چھان مارے۔ ان دونوں کا کہیں نام و نشان نظر نہ آیا۔ جواڑی کے بارے میں کچھ لوگوں نے اعتراف کیا کہ شاید ایسے کسی شخص کے بارے میں وہ تھوڑا بہت سن چکے تھے، گرچہ انھیں اس کا یقین نہ تھا کہ وہ واقعی وہی شخص تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ لیکن شاعر کے بارے میں ہر کسی نے یقین کے ساتھ کہا کہ ایسے کسی شاعر کا اس شہر میں کوئی وجود نہ تھا۔ اس کا آخری شاعر تو ساتویں دہائی میں دریا کے سات پلوں میں سے کسی سے ایک سے گذر کر نام و نمود کی تلاش میں ایک بڑے شہر کی طرف کوچ کر چکا تھا۔

○ ○ ○

اس سات پلوں والے شہر میں وہ میرا تیسرا اور آخری دن تھا جب میں نے اپنے دور کے رشتے دار کی حویلی کی طرف آخری بار رخ کیا۔

میں حویلی کے ٹوٹے ہوئے پھاٹک کے سامنے کھڑا تھا۔ اندر پہلے کی مانند ہی جانور اینڈ رہے تھے بلکہ ان میں اب کئی کتے بھی شامل ہو گئے تھے۔ بارش کو رکے

چوبیس گھنٹوں سے زیادہ ہو چکے تھے۔ آسمان پر بادل بدمست ہاتھیوں کے جھنڈ کی طرح گزر رہے تھے۔ سفری تھیلی پیٹھ پر اٹھائے میں حویلی کے بند دروازوں اور دریچوں کے باہر پہلے کی طرح منڈلاتا پھرا۔

میں نے ایک کوتاہ قد پیڑ سے ٹہنی توڑ کر ایک چھڑی بنائی، قبرستان میں داخل ہوا اور چلتا ہوا اس چبوترے کے سامنے ٹھہر گیا جس پر جنازہ رکھ کر نماز ادا کی جاتی تھی۔ اس کے زیادہ تر جگہ سے پلستر پگھل جانے کے سبب اندر کی اینٹیں نظر آرہی تھیں جنھیں کائی نے ڈھکنا شروع کر دیا تھا۔ چبوترہ اب بھی گیلا تھا مگر اس کی پرواہ کئے بغیر میں اس پر بیٹھ گیا اور سفری تھیلی کے بندھن سے خود کو آزاد کر کے دونوں گھٹنوں پر سر رکھ کر قبرستان کے ویرانے کو تاکنے لگا۔ مجھے شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا جو جسمانی سے زیادہ نفسیاتی کہی جا سکتی تھی۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ کھلی تو ایک بہت ہی لاغر بوڑھا جس کا چہرا شہابی تھا اور جسے میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا میرے بغل میں بیٹھا میری طرف تاک رہا تھا۔

''آپ!'' میں نے چونک کر کہا۔

''تمھیں بہت دیر ہوگئی۔'' وہ لاچارگی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''شاید میں وقت سے پہلے آگیا تھا۔''

''نہیں، تمھیں بہت دیر ہوگئی۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور انھوں نے بچوں کی ان بے شمار ننھی قبروں کی طرف اشارا کیا جو ایک قطار سے ہمارے سامنے جمع ہوگئی تھیں۔ ''وہ تمام کے تمام وقت سے پہلے آگئے تھے اور تمھیں بہت دیر ہوگئی۔ کوئی صحیح وقت پر نہیں آتا۔''

وہ اٹھے اور چلتے ہوئے تھوڑے فاصلے پر ایک کھلی قبر کے اندر اتر گئے۔

میں نے آنکھوں کو مسل کر دیکھا۔ پیڑ کی گھنی شاخوں کے اندر سورج کی کرنیں

جاگ رہی تھیں اور میرے سامنے کوئی منحنی قبر نہیں تھی۔ بچوں کی ساری قبریں تو اپنی اپنی جگہ جھاڑیوں کے اندر بکھری پڑی تھیں۔

آسمان پر سورج پھر سے پوری آب و تاب سے نکل آیا تھا۔ میں اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا جب مجھے جھاڑیوں کے پیچھے کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گیلے پتوں کو ہٹا کر دیکھا، دوسری طرف ایک تین فیٹ کا بونا شخص چٹان کے ایک بے ڈول ٹکڑے پر بیٹھا اس کی ناہموار سطح پر تاش کے پتے سجا رہا تھا جو ہوا سے اڑ اڑ کر زمین پر گرتے جا رہے تھے۔ دوسرا شخص نہ صرف یہ کہ کافی لمبا چوڑا تھا بلکہ اس کا سر اور منھ واقعی کسی پہاڑ کی یاد دلاتے تھے۔ اس کی شیروانی کے زیادہ تر بخیے ادھڑے ہوئے تھے۔ گلے میں ایک چرکٹ مفلر لپیٹے اپنی بیاض بغل میں دبائے وہ قبروں کے بیچ ٹہل رہا تھا اور سخن پر طبع آزمائی میں مصروف تھا۔

''یہاں کھیلنا ناممکن ہے۔'' تنگ آ کر جواری نے کود کر زمین پر آتے ہوئے کہا۔ وہ پتوں کو اپنے بچوں کی طرح ننھی منی انگلیوں سے اٹھا اٹھا کر انھیں حیرت سے تاک رہا تھا جیسے مٹی سے مس ہو کر پتوں کا کردار بدل گیا ہو۔ ''اس بدنصیب زمین پر کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔''

''یہاں کا سارا ماحول ہی بگڑا ہوا ہے۔'' شاعر نے بیاض اپنی شیروانی کی لانبی جیب کے اندر واپس ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی شعر موزوں نہیں ہوتا۔ واقعی یہاں کی زمین مردہ ہو چکی ہیں۔ شعر کہا جائے تو کس زمین پر۔''

''عجیب آدمی تھا نور الدین۔'' جواری اپنی زبان کے چٹخارے لے رہا تھا۔ اپنے تمام پتے یکجا کر کے وہ چٹان پر آبیٹھا تھا۔ ''اسے خدا کے وجود میں یقین تھا۔''

''مگر اس سے زیادہ شیطان میں اس کا ایمان تھا۔ اس نے کبھی ہمارے سامنے اس بات کا اقرار نہیں کیا مگر اس نے شیطان سے خفیہ معاہدہ کر رکھا تھا۔'' شاعر نے

اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے اور خار دار جھاڑیوں کے بیچ گھاس سے ڈھکی ہوئی گیلی زمین پر پہلے کی طرح سر جھکائے ہوئے ٹہلنے لگا۔ ''اس نے بے ایمانی سے کافی دولت کمائی۔۔۔''

''۔۔۔اور اسے ایمانداری سے غریب غرباء پر لٹا دیا۔'' جواری نے جملہ مکمل کیا۔ ''سوائے اس جائداد کے جو اس کے پرکھوں کی تھی اور عزت ماب عدالت کے طفیل کھنڈر کی شکل میں اس کے پرکھوں کو واپس لوٹنی تھی۔''

''ہم نے اسے کبھی صحیح مشورے نہیں دئے۔''

''نہ اس نے کبھی ہماری بات مانی۔'' جواری نے کہا۔ ''اس نے کبھی اپنے پتے ہمارے سامنے نہیں کھولے۔ ہم بیکار کے لنگوٹیا یار تھے۔''

میں مسکرایا اور میں نے آسمان کی طرف دیکھا جو پھر سے تاریک ہو چلا تھا۔ یہ دنیا واقعی ایک حیرت انگیز جگہ ہے، میں نے تھیلی پیٹھ پر لاد کر اس کے بکلس لگاتے ہوئے سوچا۔ یہاں انسان یا تو وقت سے پہلے چلا آتا ہے یا اسے آنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ میں سات پلوں والے شہر سے واپس لوٹ آیا ہوں۔ میرے بیوی بچے بھی یہی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں، میں وہاں سے کبھی لوٹا ہی نہیں۔ اس دنیا میں کچھ لوگ کبھی واپس نہیں لوٹتے!

○ ○ ○

اچھا خاصا چیروا

'We must take him back now. Before the spirits of the forest start to smell him, 'she said o Ben okri o The Famished Road

جاڑے کی ایک صبح ایک قبائلی اپنے سور کے ساتھ پہاڑ سے اُترتا دکھائی دیا۔ وہ اسے بیچنے کے لیے جس قصبہ کی طرف جارہا تھا، وہاں عیسائی آباد تھے۔ مشن اسپتال کے باہر جس کی بنیاد پر یہ قصبہ بسا ہوا تھا اس نے سور کی تھوتھنی کو اپنے کرتے کے کونے سے صاف کیا اور کہا:

"رات بھر جانے کتنے لوگوں کا منہ تجھے دیکھ کر پانی سے بھر آیا ہوگا۔"

سور کا رنگ خاکستری تھا۔ اس کے جسم کی ایک ایک پور سے پسینہ چھوٹ رہا تھا اور وہ بڑی بدتمیزی سے ریاح خارج کر رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد مذبح تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس اذیت ناک زندگی سے نجات ملے۔ گرچہ آدمی کا ذہن اس کے اس ارادے کو سمجھنے سے قاصر تھا مگر سور نے اپنا فیصلہ خود کو سنا دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح بے رحمی کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تیز دھار والے آلے سے کٹنا زیادہ پسند تھا۔ گاؤں کی واحد پگیری ایک چھپر کے نیچے واقع تھی جسے الفانسو ہیمبرم چلاتا تھا۔ اس چھپر پر دائمی طور پر ایک دو گدھ یا چیل بیٹھے پہرا دیا کرتے۔ گاؤں کے تمام سوروں کا سفر اسی چھپر کے نیچے ختم ہوتا تھا مگر جنگلیوں کے عام رواج کے مطابق وہ سوروں کو اذیت

دے دے کر، ڈھلانوں میں یا چٹانوں کے گرد دوڑاتے ہوئے بھالوں سے بھونک بھونک کر انھیں نڈھال اور نیم جان کر دیتے۔ پھر الفانسو ہیمبرم کے گدھ پوش چھپر کے نیچے اس سانس لیتی ہوئی لاش پر آخری کام ہوتا۔

سور اپنی تھوتھنی اُٹھا کر مشن اسپتال کے آہنی پھاٹک کے غیر مستعمل سرے پر چڑھی ہوئی موگنبیلیا کی بیل کو سونگھ رہا تھا۔ اندر تا حدِ نظر پھیلے ہوئے لان میں سر بلند پیڑوں، کیکر، شہ توت اور دوسری جنگلی کنٹیلی جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس جنگل میں دوڑتی گلہریوں، پھدکتی چڑیوں اور کیڑے مکوڑوں کو دیکھ رہی تھیں، جنھیں عام انسانی آنکھیں عام طور پر دیکھنے سے معذور ہوتی ہیں۔

''ہر جگہ ایک ہی سی دنیا چل رہی ہے۔'' سور نے خود کو دلاسا دیا۔ ''قدرت نے ہر چیز کو پیدا کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اس کے زندہ رہنے کے لیے ایک دوسری چیز پیدا کی جائے۔ اس نے انسان کے لیے مجھے پیدا کیا اور میرے لیے کیڑے مکوڑے اور ان حشرات الارض کے لیے انسان۔ گویا چکر جاری ہے۔''

لڈو چیروا، جو دراصل اس پہاڑی کا نام تھا، ان دنوں زیادہ چالاک بننے کی جدوجہد میں مبتلا تھا۔ اسی لیے اس نے الفانسو ہیمبرم کو نظر انداز کر دیا تھا مگر اب اسے پتہ چل رہا تھا کہ سور کو بیچنا، جسے وہ اتنے اوپر سے ڈھو کر لایا تھا اتنا آسان کام نہ تھا۔ اول تو گائے، بیل، بکریوں کی طرح اس کا کوئی ہفتہ وار ہاٹ نہیں لگتا تھا، دوسرے سور کو کسی چوراہے پر کھڑے ہو کر بیچنے کے لیے بولی لگانا کچھ اٹ پٹا سا عمل تھا۔ لڈو چیروا کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور وہ بار بار تھوک کے گھونٹ حلق سے نیچے ڈھکیل رہا تھا۔ فی الحال اسے (''اور مجھے بھی'') پیاس بجھانے کے لیے کسی کنویں یا سرکاری نل کی ضرورت تھی مگر وہ واحد کنواں جسے وہ اور خنزیر دیکھ پا رہے تھے وہ اسپتال کے لان میں جھاڑیوں اور قدیم داڑھی دار پودوں کے بیچ نظر آ رہا تھا۔ کنویں کی منڈیر پر ایک رنگین گرگٹ چوکنا بیٹھا پہرا دے رہا تھا۔

''یہ کنواں کچھ زیادہ استعمال میں نہیں آتا ہے شاید۔'' سور سوچ رہا تھا۔ ''شاید اس

کے پانی میں سانپ اور دوسرے کیڑے مکوڑے کلبلا رہے ہوں۔"

لڈو چیروا سور کو گھسیٹتے ہوئے اسپتال کے لان میں داخل تو ہوا مگر اس کے دل کے اندر بھی کچھ اس قسم کے وسوسے سر اُٹھا رہے تھے۔ کنویں کا گھیرا کافی بڑا تھا اور اس کی دونوں چرخیاں سلامت تھیں۔ ایک پرانا زنگ کھایا ہوا ڈول نائلن کی بے رونق رسی کے ساتھ کنواں کے صحن پر دھرا تھا۔ لڈو چیروا نے ڈول اُٹھا کر چرخی کے اوپر سے گزارتے گزارتے ایک نظر کنویں کے اندر ڈالی۔ کنویں کی اندرونی دیوار جھاڑیوں اور پودوں سے تڑخ رہی تھی۔ پیندے کا پانی ہلال کی شکل میں چمک رہا تھا۔

"کم از کم ڈول سے اس بات کا پتہ تو چلتا ہے کہ اس کا پانی استعمال میں آتا ہے۔" لڈو چیروا نے ڈول کو چرخی پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ چرخی کے بولنے کی آواز سے سور چونک پڑا۔ اس نے کنوئیں کی منڈیر پر رسی اور ڈول کے دباؤ سے جھکے ہوئے لڈو چیروا کے جسم کو دیکھا۔ "کاش" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ کوئی غیبی طاقت اسے اندر کھینچ لے مگر اس سے نقصان تو میرا ہی ہے۔ میں اپنی پیاس کیسے بجھاؤں گا۔"

پانی ٹھنڈا اور نمکین تھا جیسے کسی نے اس کا سارا مزا نکال لیا ہو۔ دونوں کے پیٹ جتنا سہار سکتے تھے وہ اس سے زیادہ ڈکار گئے۔ سور اپنی تھوتھنی اسی دوران کنوئیں کے صحن کے کنارے کی ہری گیلی گھاس کے اندر ڈال چکا تھا اور زمین کوڑنے لگا تھا۔ لڈو چیروا نے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ کاش میں بھی سور ہوتا اور مجھے اپنی بھوک مٹانے کے لیے اتنی احتیاط سے کام لینا نہ پڑتا۔ اگر سور بک گیا ہوتا تو وہ پیٹ بھر ہنڑیا کھا کر اور تھوڑی دیسی شراب اوپر سے انڈیل کر کب کا پہاڑ کی طرف روانہ ہو چکا ہوتا۔ آہ، پہاڑ کے نیچے کی دنیا کتنی خوفناک، کتنی وشال ہے۔ کتنا عجیب ہے سب کچھ اس میدان میں۔ اس سپاٹ دھرتی پر آسمان سے اتنی دور رہ کر کیسے لوگ زندہ رہ پاتے ہوں گے؟ اسے تو ابھی سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا بدن آدھا زمین کے اندر دھنس گیا ہو۔ سب کچھ اس کے اوپر ہو اور وہ سب کے پیروں کے نیچے۔

"پہاڑ کی ڈھلانوں میں کتنی بلندی پر ہوا کرتے تھے ہم لوگ۔" سور سوچ رہا تھا۔"

کتنی پستی ہے یہاں۔ اب بہتر یہی ہے کہ جلد سے جلد میرا قصہ پاک ہو جائے۔ ایک بات تو طے ہے۔ میں ان میدان والوں کے ہاضمے کے لیے ایک کڑا امتحان ضرور ثابت ہوں گا۔ میں ایک پہاڑی سور ہوں۔ خالص ہوا میں سانس لی ہے اور پتھر کو چیر کر نکلا ہوا پانی پیا ہے میں نے۔ کسی کمزور آنت کے بس کی بات نہیں ہوں میں۔"

لڈو چیروا ہاتھ منہ دھو کر کدم کے ایک پیڑ کے نیچے کھڑا اس کے مدور ریشے دار پھولوں کو تاکتے ہوئے انگوچھے سے نتھنے پونچھ رہا تھا جب اس نے ان تینوں کو دھیرے دھیرے چل کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ لوگ عجیب ڈھنگ سے چل رہے تھے جیسے زمین ان کے موافق بنائی نہ گئی ہو۔ وہ ذرا قریب آئے تو بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ یہ تینوں کوڑھ کے مریض تھے۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں میں انگلیاں برائے نام رہ گئی تھیں۔ تینوں دلچسپی سے لڈو چیروا کی طرف تاک رہے تھے، ان کی دھنسی ہوئی ناکوں کو دیکھ کر لڈو چیروا پریشان ہو گیا۔

"یہ کوڑھیوں کا اسپتال تو نہیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بالکل!" ایک کوڑھی نے جواب دیا۔ "اور اگر فادر ریڈرک کو پتہ چلے کہ تم نے ہمارے کنوئیں کا پانی پیا ہے تو ہماری خیر نہیں۔ یہ سور تمہارا ہے؟ اسے کہو زمین کو اس طرح کوڑ کر برباد نہ کرے۔ بیچنے کا ارادہ ہے؟"

"اور کیا!" لڈو چیروا نے کہا۔ "مگر میرے پانی پینے سے تمہارے لیے مصیبت کیوں کھڑی ہو گئی۔"

"خیر جانے دو۔" دوسرے مریض نے کہا۔ "اسے فادر ریڈرک کے پاس لیے چلتے ہوں۔ سور صحتمند دکھائی دے رہا ہے۔ ممکن ہے فادر ریڈرک اسے اسپتال کے کچن کے لیے خرید لیں۔ تم اپنے جانور کو لے کر ہمارے پیچھے آسکتے ہو۔ کچھ نام وام دیا ہے اسے جسے سن کر یہ اشارہ قبول کرے۔"

"جیسے پہاڑی اتنے تہذیب یافتہ ہوتے ہیں!" سور نے چاروں کے پیچھے چلتے چلتے سوچا۔ "یوں بھی ہم سوروں کی الگ پہچان کہاں ہوتی ہے۔ ان جنگلیوں کو اپنے

برچھے ہماری مقعد میں ڈالنے سے فرصت ہی کہاں کہ ہمیں کوئی نام دیں۔ ہمیں تو بغیر نام کے ہی مرنا پڑتا ہے۔''

کھچڑی داڑھی کے اوپر فادر ریڈرک کے ہونٹ گلاب کی طرح سرخ تھے۔ وہ اپنے کھپریل نما چھپر والی بنگلیا کے اونچے برآمدے پر بیت کی کرسی پر بیٹھے پائپ پی رہے تھے اور اپنی ناک کے بال توڑ رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت لوہے کی تپائی پر اس کے لیے چائے رکھ رہی تھی۔

''تو یہ سور تمھارا اپنا ہے! کہیں سے چرایا تو نہیں ہے تم نے اسے؟ اور میں بھی عجیب بیوقوف ہوں۔ بھلائی کوئی چور یہ قبول کرے گا؟'' فادر ریڈرک نے اپنی ناک کے ٹوٹے ہوئے بال کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا جس کے منحنی سرے پر رطوبت کا گلوبچہ چمک رہا تھا۔ ''اس اسپتال کا پتہ تمھیں کس نے دیا؟''

''ہمارے پہاڑ کے اس طرف اُتر کر مجھے معلوم تھا مائی باپ آپ کا اسپتال ہے۔''

''ارے مجھے مائی باپ نہ کہو۔ میں تو بس ایک ڈاکٹر ہوں یہاں۔'' فادر ریڈرک ہنسے۔ ''صرف اپنے گورے چمڑے کے لیے مشہور ہوں۔ اپنے ملک میں تو میرے لیے سوائے مردے پھاڑنے کے دوسرا کوئی کام میسر نہ ہوتا مگر میں یہ تجھ جنگلی سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ اس سے بہتر ہے کہ تیرے سور سے بات کی جائے۔''

''بالکل!'' سور نے تھوتھنی اوپر کر کے کہا۔ ''ہم سور ضرور ہیں مگر ہماری آنکھیں دور بین ہیں اور فادر ریڈرک، ہمارا پیٹ چیر کر آپ دنیا جہان کا علم برآمد کر سکتے ہیں مگر اتنی دور اندیشی کس کے پاس ہے بھلا۔ شاید یہی میرے سورپن کی دلیل ہے کہ میں بہت جلد اُمیدیں لگا بیٹھتا ہوں اس سے قطع نظر کہ ایک سور کے لیے انسان کا ردعمل یکساں طور پر تحقر سے بھرا ہوتا ہے چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو۔''

''فادر ریڈرک رحم!'' لڈو چیروا برآمدے پر اتنا جھک گیا تھا کہ اس کی ناک لال پکے کو چھو رہی تھی۔ ''میں نے اسپتال کے کنویں کا پانی پیا ہے۔ کیا میری بھی ناک بیٹھ جائے گی؟''

''ہاں بالکل، میری طرح، دیکھ ادھر کیونکہ میں تو اسی اسپتال کے اندر رہتا ہوں۔ اس کا پانی پیتا ہوں۔ اس میں نہاتا ہوں۔'' بوڑھے سیڈرک نے اپنی ناک انگلی سے دبا کر پچکاتے ہوئے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

''رحم مائی باپ!'' لڈو چیرو اروریا تھا۔'' آپ یہ سور بلا قیمت رکھ لیں مگر مجھے اس مرض سے بچالیں۔ میں اب باقی زندگی کبھی پہاڑ سے نیچے نہیں آؤں گا۔'' لڈو چیروا نے مڑ کر سور کی پسلیوں میں اپنی کہنی سے ٹھوکر لگائی۔ ''سب کچھ اس حرامی کے چکر میں ہوگیا سرکار۔ الفانسو ہیمبرم اپنے غلیظ دانت نکال کر مجھ پر ہنسے گا۔''

''حرامی تو۔ میں تو بس چند ہی دنوں کا مہمان ہوں۔'' سور نے کہا اور رسی کی رگڑ کو اپنے بدن پر محسوس کیا۔'' اور الفانسو ہیمبرم مرنے کے بعد یقیناً سور بن کر پیدا ہوگا اور یہ لکھ لینا کسی فادر سیڈرک کے اسپتال میں اس پر چھرے چلیں گے۔''

''رحم فادر، رحم!'' لڈو چیروا کے سفید آنسو لال فرش پر موم کے قطروں کی طرح جم رہے تھے۔ مجھ پر بپتسمہ کرالیں۔ میرے گلے میں کتے کا پٹا ڈال دیں۔ مجھے سور کی انتڑیوں میں ڈال کر گھسیٹیں مگر اس کوڑھ کے مرض سے نجات دلائیں۔ میں نے اسپتال کے کنویں کا پانی پیا ہے۔

اور میں نے بھی۔ سور نے کہا۔ مگر میں تو تھوڑے ہی عرصے کا مہمان ہوں۔ وہ سوچیں جن کے پیٹ میں میں بسنے والا ہوں۔

فی الحال تو تم زمین سے کوڑھ کے جراثیم اپنی ناک پر بٹور رہے ہو۔ فادر سیڈرک کو اپنے مذاق پر اتنا لطف آیا کہ وہ اپنی کرسی پر گھوم سے گئے۔ جنگلی گدھے۔ کوڑھ تمھارے مغز میں ہے، پہلے اسے باہر نکالو۔ اور اس جانور کو کسی دوسری جگہ بیچو۔ ہمارے اسپتال میں اتنا بڑا دیگچا کہاں ہوگا بھلا۔''

رحم فادر! لڈو چیروا کے الفاظ گلے میں اٹک رہے تھے مگر فادر سیڈرک اٹھ کر بنگلیا کے اندر جا چکے تھے۔ تینوں مریض اپنے اپنے وارڈ کی طرف چلے گئے جو ان کی اپنی ہی بنائی ہوئی کھپریل کی جھونپڑیوں پر مشتمل تھے جن کی مٹی اور گارے کی دیواروں پر

کھریا اور رنگین مٹیوں سے پھول اور پتے بنے ہوئے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ یہاں آنے والے اکثر مریض دائمی طور پر اس اسپتال کا حصہ بن جاتے ہیں۔

اب چلو بھی۔ سور نے کہا۔ بہتر ہوگا کہ ہم پہاڑ لوٹ چلیں اور الفانسو ہیمبرم کا تلوا چاٹیں۔

اسپتال کے باہر نصف فرلانگ کی دوری پر اسپتال سے چھٹکارا پانے والے مریضوں کا ایک گاؤں آباد تھا، کیونکہ وہ اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ گھروں کو لوٹ سکیں۔ اس کے چوراہے پر سورج ایک بڑے سے رنگین گولے کی شکل میں کرنج کے ایک پیڑ پر رکھا ہوا تھا۔ چوراہے پر گاؤں والوں کی بھیڑ تھی۔ ابھی ابھی وہاں مینڈھیں لڑائے گئے تھے۔ لوگ اس واقعہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ ہارا ہوا بکرا اپنے ٹوٹے ہوئے سینگ کی بے حرمتی اُٹھائے ہوئے کھڑا تھا۔ لڈو چیروا کے سور کو دیکھ کر لوگ اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

کتنے میں خریدا؟

ضرورت سے زیادہ صحت مند ہے۔ بیمار تو نہیں۔ اب سمجھا، یہ تو پہاڑی سور ہے۔

اسے اسپتال میں جا کر بیچو۔ ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں! ہم تو شہروں میں جا کر بھیک مانگتے ہیں یا بڑے پادری کے گرجے کے باہر لائن لگاتے ہیں۔

ایک بوڑھا اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور اس نے لاٹھی کی نوک لڈو چیروا کی قمیض سے لگائی۔ موٹی موٹی عینکوں کے باوجود اس کی آنکھیں بالکل ہی معذور تھیں۔

''تم نے سور کو کپڑے کیوں پہنا رکھے ہیں؟''

سارے لوگ ہنس پڑے۔ سور بھی مسکرا دیا۔

کسے خبر تھی، ایک بوڑھے کی آنکھیں اتنی صاف دیکھ سکتی تھیں۔ مبارک ہو بوڑھے گنہگار۔ میرے جسم کا سب سے اچھا پارچہ تمہارے نصیب میں ہوگا۔

گاؤں کے دو شرابی کہیں سے ایک خارش زدہ کتا اُٹھا لائے اور اسے لڈو چیروا اور اس کے سور پر چھوڑ دیا۔ کتا جو خود بھی ڈرا ہوا تھا، اتنے سارے لوگوں کی شہ پا کر دور

سے بھونکتا رہا مگر دونوں خوفزدہ ہوکر گاؤں سے بگٹٹ بھاگ نکلے۔ سور آگے آگے تھا اور اس کی رسی تھامے، اس کے ساتھ خود کو کھنچاتے ہوئے لڈو چیروا پیچھے پیچھے یہاں تک کہ بھاگتے بھاگتے زمین ختم ہوگئی اور وہ پہاڑ کے نیچے پہنچ گئے۔

○○○

الفانسو ہیمبرم اپنی جھونپڑی کے باہر کھڑا تھا جب اس نے ڈھلان میں، جہاں چٹانیں مینڈکوں کی طرح اُبھری ہوئی تھیں اور ضدی پیڑ اپنی مری جڑوں کے ساتھ کھڑے تھے لڈو چیروا کو دیکھا۔ وہ اکیلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پی رکھی تھی۔ اس نے رات کہاں گزاری تھی اس کا نشان اس کے بدن پر موجود نہ تھا۔ لڈو چیروا الفانسو ہیمبرم کے مذبح کے سامنے ایک مینڈک نما چٹان پر بیٹھ گیا اور اس نے سور بیچنے کا واقعہ یوں بیان کیا۔

الفانسو، میرا سور بیمار تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے گاؤں والے اس کا گوشت ڈکاریں۔ میں نے جو کچھ کیا، گاؤں والوں کے لیے کیا مگر بدلے میں کوئی میرا احسان مند کب ہوگا۔ خیر مجھے اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں اس کے بغیر بھی انتہائی بدنصیب ہوں۔ میں نے گاؤں کی رسم توڑی ہے اور اس کی سزا کے طور پر تم دیکھ سکتے ہو میری ناک پچکنے والی ہے کیونکہ میں نے ایسے کنویں سے پیاس بجھائی ہے جس کے پانی سے کوڑھ کے مریض نہاتے ہیں۔ تو میں سور کو بیچنے میں ناکام واپس آرہا تھا کہ پہاڑی ڈھلان پر ایک تین جھونپڑوں والے گاؤں پر رات ہوگئی اور میرے سور نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ آہ، مجھے کیا پتہ تھا، یہ تینوں جھونپڑیاں تین چڑیلوں کی تھیں جو سورج ڈوبتے ہی پیڑوں میں جا بستی ہیں۔ ہم نے انھیں ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہروں پر جھریاں تھیں اور آنکھیں چربیوں کی تہ میں غرق۔ ہمیں دیکھ کر وہ کھسیا رہی تھیں۔ انہوں نے قریب کے تین پیڑ چنے اور ان پر بیٹھے بیٹھے ہمیں بدتمیزی سے تنبیہ کرنے لگیں۔ ان کی آوازیں اس طرح آرہی تھیں جیسے برسات کی

طوفانی ہوا بانس کے جھنڈے کے اندر سے سنسناتی آ رہی ہو۔

اچھا خاصا چیروا۔ تیری کھوپڑی گل جائے! سور دے دے۔

بوڑھا بھینسا چیروا۔ تیرا فوطہ گل جائے! سور دے۔

ناٹا بھتیا چیروا۔ تیرا آدھا گل جائے! سور دے دے۔

الفانسو، قسم لے لو جو میری زبان سے پہلے پہل ایک بھی لفظ نکلا ہو مگر میں کب تک برداشت کرتا۔ میں بھی انسان تھا، مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں پتھر اٹھا اٹھا کر ان چڑیلوں پر پھینکنے لگا۔ وہ ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر کود رہی تھیں، کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں، پاد رہی تھیں۔ اچھا خاصہ چیروا گا رہی تھیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میرا سور بھاگ نکلا اور مجھے اس کی تلاش میں پہاڑ سے واپس میدان میں اترنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے باہر سرسوں کے کھیتوں کے بیچ سور بھاگا جا رہا تھا اور جب میں نے اس کی رسی تھامی تو وہ ایک مکان کے لکڑی کے دروازے پر تھوتھنی رگڑ رہا تھا جو گاؤں سے الگ تھلگ ایک سنسان جگہ پر کھڑا تھا۔ دروازہ ایک خوبصورت سی بچی نے کھولا تھا۔ رات ہم دونوں نے اس مکان میں گزاری۔ اس کے مالک کا نام رس راج ٹوڈو تھا۔ وہ سرسوں اور گنّے کی کاشت کرتا تھا اور گنّے کے موسم میں جب بدمست ہاتھیوں کے غول پہاڑ سے اترتے ان سے نپٹنے کے لیے اسے سرکار نے بندوق دے رکھی تھی۔ میں نے جب اپنا پورا واقعہ سنایا تو اس نے تشویش کا اظہار کیا اور از راہِ ہمدردی مجھے شراب پلائی۔ اس کی بیٹی میرے سور سے کھیل رہی تھی، اسے کھانا کھلا رہی تھی، اسے نام دے رہی تھی۔ اس رات میں نے ٹوڈو کے کمبل میں بڑی بے چین نیند گزاری۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ اول تو وہ کمبل ضرورت سے زیادہ آرام دہ تھا۔ دوسرے رات بھر وہ چڑیلیں مکان کے باہر چکر لگاتی رہیں۔ اچھا خاصا چیروا گاتی رہیں۔

بڑی بدروحوں والی رات ہے! رس راج ٹوڈو بھوت پریت کے معاملات میں ایک ڈرپوک عیسائی تھا۔ وہ بار بار اٹھ کر عیسیٰ مسیح کی مورتی کے سامنے موم بتی جلا رہا تھا۔ باہر بڑی ٹھنڈ تھی۔ میرے خیال سے پہاڑ کے اوپر کی طرف ہی کہیں پالا گرا ہو گا۔ پیڑ

پودے بھی اس دھوپ کے باوجود گیلے دکھائی دے رہے ہیں۔ تو رات بھر تیز ہوا چلتی رہی اور تینوں چڑیلیں گاتی رہیں۔

اچھا خاصا چیروا۔ تیرے بال میں لٹکے بچھو! سور دے دے۔

اچھا خاصا چیروا۔ تیرے کان میں گھسے کان پھیڑو! سور دے دے۔

اچھا خاصا چیروا۔ تیرے بدن سے چپکے چلھڑ! سور دے دے۔

صبح نیند سے اُٹھ کر میں نے فیصلہ کیا میں اپنے سور کے ساتھ کبھی ان چڑیلوں کے جنگل سے گزر کر گھر واپس نہیں آسکتا اور میں نے اپنے دوست رس راج ٹوڈو کو سور تحفے میں دے دیا، جسے اس کی بڑی بیٹی نے فوراً ایک نام دے ڈالا اور سرسوں کے کھیت میں سیر کرانے چل دی۔

الفانسو ہیمبرم، کیا میں نے غلط کام کیا۔

الفانسو ہیمبرم نے کھانس کر گلا صاف کیا، اپنی بھینگی دانش مند آنکھوں سے آسمان کو ناپا، احترام کے ساتھ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور کہا۔

روحیں ہمارے پہاڑوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ کوئی ان کا قانون نہ توڑے ورنہ اس کا حشر بھی لڈو چیروا کی طرح ہوگا۔

○ ○ ○

میں کوّے شاہ

مینا، وہ مینا۔ وہ ہمارے محلّے کی آخری تاریخی دیوار سے تھوڑی دور شاہی چبوترے پر برہنہ پائی گئی تھی جب کہ اس کی سبز آنکھیں نیلے آسمان کا احاطہ کر رہی تھیں۔ تاریخی دیوار کے اینٹ کے صحن پر اب مسکینوں کا غلبہ تھا۔ ان میں گوٹا کناری، زربفت اور کمخواب کی دنیا سے آئے ہوئے لوگ بھی تھے جنھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے میں کسی طرح کی تبدیلی قطعی طور پر قبول نہیں کی تھی۔

چائے کی ایک بے سر پیر کی دکان، ایک عوامی پیشاب خانہ اور شاہی چبوترے پر سگریٹ کی پنّی سے منشیات کا دھواں اٹھاتے ہوئے جلالی فقیران، انگیٹھی شاہ، ہاتھ کٹورے والے، منگی شاہ، میخ شاہ، جاگیان، نر بے تان، سبھوں کو حیرانی تھی۔ مینا کے سلسلے میں ایک بات طئے تھی کہ اسے نیم برہنہ کرنے والوں نے شاید اپنی غلطی کے اعتراف کے طور پر اس سے احتراز کیا تھا اور اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ جو کوئی بھی رہے ہوں، ان کی نشاندہی آسان بات نہ تھی۔ وہ اس لیے کہ پہلا شخص جس نے آبخورے سے اسے پانی پلایا، اس نے دیکھا پری کی سبز آنکھیں کسی کی طرف بھی نہیں تاکتی تھیں۔ دوسرا یہ کہ اس سے کچھ اگلوا لینا آسان نہ تھا۔ اس کی زبان تلوے سے دائمی طور پر چپک گئی تھی۔ گرچہ اس کا یہ مطلب ہرگز نکالا نہیں جا سکتا کہ کھانے پینے کے وقت وہ اس کا استعمال نہ جانتی ہو۔ یہ استعمال تو جانوروں کو بھی بخوبی

آتا ہے۔ مینا، اس شخص نے اسے یہ نام دینے میں دیر نہ کی۔ اس نے اسکے لیے ایک سیلن زدہ کوٹھری صاف کی جس کے باہر کے تنگ برامدے پر وہ اپنا بستر بچھا کر سونے لگا۔ مگر کچھ سائے اس کے برامدے کے آس پاس اور خود اس کے اپنے ذہن کے اندر منڈلانے لگے۔ دوسرے دن سورج نکلنے پر اس نے اعلان کیا کہ وہ اس کی دور کی رشتہ دار ہے جو اسی کی تلاش میں ادھر آنکلی تھی۔ مگر ان سایوں کے لیے یہ ہتھکنڈے کامیاب ثابت نہ ہوئے۔ جب سایوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا تو وہ اسے لے کر شیخ سیف الدین ملتانی کے درِ اقدس پر حاضر ہوا اور اس نے ان سے پناہ مانگی۔

شیخ سیف الدین ملتانی اپنی پیری تیاگ چکے تھے اور اب وہ اپنے آستانے کے اندر حجرے کے چاروں طرف اگے ہوئے خودرو پودوں کی رکھوالی کیا کرتے۔ ''حضور کرم فرما جناب بندہ امان کا طالب ہے۔''

''جا یہاں سے گذر۔'' شیخ نے کہا کیونکہ اسے یہ علم تھا یہ بندے اپنی دنیا سے باہر کا سفر اسی کے درِ اقدس سے شروع کرنے کے عادی ہیں۔ پیری تیاگنے کے بعد بھی قدمبوسی کے لیے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ زائرین سے ملنے سے منع کرنا ایک ایسا واقعہ تھا جس نے لوگوں کو اور بھی اپنے طلسم میں گرفتار کر لیا تھا۔ اب تو ان کے حجرے کے باہر کی جھاڑیاں بھی مقدس اور پر اسرار ہو گئی تھیں۔ کسی کسی جھاڑی میں تعویذ اور دھاگے بھی بندھے نظر آنے لگے تھے۔ باہری دیوار کے طاقچے پر ایک سفید بلی نے دائمی طور پر اپنا

ٹھکانہ بنا لیا تھا اور دیکھتے دیکھتے حاملہ پائی گئی تھی۔ حجرے کا دروازہ شاذ و نادر ہی بند ہوتا اور وہ بلی ایک بیکار سی اضافی شئے کی طرح کہیں بے مقام کھڑی اپنی دم ہلاتی یا بے وقت کا راگ الاپتی رہتی۔

عورتیں حجرے کی جالیوں سے لگ کر رو سکتی ہیں مگر دروازے سے گذر کر اندر

نہیں جا سکتیں۔ مینا نے حجرے کے باہر کے صحن پر اپنے بالوں سے جھاڑو لگانے کی رسم شروع کر دی۔ آج بھی وہ رسم وہاں جاری ہے۔

شیخ سیف الدین ملتانی کے لیے یاسین تاریگامی کے مقابلے میں یہ خود اس کے لیے ایک نئے مسئلے کی شروعات تھی۔ انھوں نے منھ پھیر کر آسمان پر ہجرت کرتے پرندوں کی طرف رشک سے دیکھا اور ایک آہ بھر کر چپ ہو رہے۔ مگر کوئی چیز شاید انھیں اندر سے کرید رہی تھی۔

''اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لے آئے ہو۔ میں اس گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔'' انھوں نے یاسین تاریگامی سے کہا۔

''مگر حضور، وہ تاریخی دیوار کا علاقہ مخدوش لوگوں کی آماجگاہ ہے۔'' یاسین تاریگامی نے ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اس کا منھ کھول کر بہت چھان بین کی، مگر یا حق ہمیں اس عورت کی زبان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہم کیا کر سکتے تھے۔''

شیخ سیف الدین ملتانی نے پہلی بار عورت کے سراپے کا جائزہ لیا: بھرا پرا چست بدن + قد نکلتا ہوا + آنکھیں غلافی اور پلکیں کمان سے تیر کی طرح نکلتی ہوئیں = شیخ کو جھرجھری آ گئی۔

''اس کا ضرور ایک ماضی رہا ہوگا'' آخر انھوں نے اعلان کیا۔ ''جلد یا بدیر اس کے لوگ اس کی تلاش میں آ نکلینگے جو نئی مصیبتوں کی سبیل ہوں گی۔ اسے پولس کو سونپنا زیادہ مناسب رہے گا۔''

یاسین تاریگامی کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ''پولس، اگر پیچھا چھڑانا ہی مقصد ہو تو کیوں نہ خاکزادی کی گردن پر چھری پھیر دی جائے۔''

''میرا یہ مطلب نہ تھا۔'' شیخ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ معاملہ مستورات کا ہے۔ تمھیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔''

''اسی لیے تو شیخ کی خدمت میں حاضری دی ہے جناب۔۔۔'' یاسین تاریگامی نے صحن پر گھٹنے ٹیکتے ہوئے کہا۔ ''دنیا کی کوئی طاقت اس حجرے کی دیوار سے کسی گندے مقصد کے ساتھ ٹکرانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔''

''جانے تم کس دور کی بات کر رہے ہو۔'' شیخ نے دستبردار ہوتے ہوئے کہا۔ ''جاہلوں نے اپنی دنیا آسان بنانے کے لیے یہ ساری خوش فہمیاں پال رکھی ہیں۔''

○ ○ ○

میں کوّے شاہ، میری ہوس اس دن جاگ گئی تھی جب میں نے مینا کو برہنہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر کسی وجہ سے مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملی تھی کیونکہ ایک خون سے رنگا ہوا سایہ ہمارے بیچ آ گیا تھا۔ میں دیر تک ایک پرانے متروک کھمبے پر ہاتھ ٹکائے اسے لمبی لمبی سانسیں لیتے دیکھتا رہا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد اسے واپس لے جا کر کسی ٹرین پر بٹھا دینا ضروری تھا جہاں ایسی ہی ایک دوسری ٹرین سے پچھلی رات وہ اتر آئی تھی۔ کسی نے یہ افواہ بھی اڑائی تھی کہ اس طرح اس کے اپنے لوگوں نے اس سے پیچھا چھڑایا تھا۔ تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر میں تاریخی دیوار سے الگ ہٹ کر ایک ادھڑے ہوئے آسمان کے نیچے اپنے اگلے پڑاؤ کی طرف نکل پڑا، ہم جو ہمیشہ اگلے پڑاء کے حوالے ہوتے ہیں۔ اس جگہ ڈرم کے اندر جلتے کوڑوں کی آگ پر کچھ چہرے سلگ رہے تھے۔ میں نے اس آگ سے ایک زمین سے اٹھایا ہوا سگریٹ سلگا کر کچھ وقت وہاں برباد کیا۔ فقیر اُن فسادات کا ذکر کر رہے تھے جنھیں اپنی لمبی زندگی میں وہ ملک کے مختلف گوشوں میں دیکھ چکے تھے۔ یہ لوگ میری طرح بے گھر و بے لگام تھے اور اپنی بے خواب زندگی کو اس طرح سلگانے کے عادی تھے۔ ان کے سائے آگ کی لپٹوں کے سبب لرزاں براندام، فرش پر، دیوار پر،

ایک دوسرے کے چہروں پر پھسل رہے تھے۔ ایک سائے کی ناک تو اتنی لمبی ہوگئی تھی کہ لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی ناک کے راستے خلاء میں غائب ہو جانے والا ہو۔

''میری آنکھوں کے سامنے ایک بار ایک شخص کو زندہ جلا دیا گیا۔''

''تم یقیناً اسے زندہ جلتے دیکھنے کے لیے رکے نہ ہو گے۔'' دوسرے بھکاری نے کہا۔

''میں نے ایک کوڑا دان میں پناہ لے رکھی تھی۔'' بھکاری نے کہا۔ ''اس رات ایک چوہے نے میرا دا ہنا خصیہ کتر کر اسے ہمیشہ کے لیے ناکارہ کر دیا۔''

''تم چیخ پڑے ہو گے اور انھیں تم پر ترس آ گیا ہو گا۔''

''نہیں، وہ بے ترس لوگ تھے۔ وہ میرا بھی وہی حشر کرتے۔''

''تمھارا کیا خیال ہے؟'' دوسرے فقیر نے میری طرف تاکتے ہوئے غلیظ کمبل سے اپنا جھائیوں سے ڈھکا ہوا چہرا باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں یقین ہے کہ ایک شخص کا خصیہ چوہا چبا جائے اور وہ نہ چیخے۔''

''یہ دنیا ایک بڑی پراسرار جگہ ہے۔'' میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اور اوپر والے نے انسان کو بنا کر اپنی انگلیاں توڑ ڈالی ہیں۔ ہم انسانوں سے کچھ بھی امید کر سکتے ہیں۔ ہم خدا اور ابلیس کے درمیان کی رسی ہیں، یہ رسہ کشی ازل سے جاری ہے۔ جو جس طرف زور سے کھینچتا ہے، ہم اس کی طرف ہو لیتے ہیں۔''

''لاجواب'' یک غدودی تناسل والے فقیر نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ اس نے آگ سے دہکتے ڈرم پر جھک کر اپنی بیٹھی ہوئی ناک پر شعلوں کی تپش محسوس کی۔ ''تم جو جواب چاہ رہے تھے وہ تمھیں مل گیا۔ اب ہمیں اپنے اس نئے دوست کا استقبال کرنا چاہیے۔''

اور جب کہ وہ چاروں میری طرف متوجہ ہو رہے تھے میں نے ایک لمبی سانس

کھینچی۔ مجھے اس عورت کی یاد آرہی تھی۔ ہوس پھر سے میرے اندر آگ کی طرح سلگنے لگی تھی۔ میں کوّے شاہ، اب میں کسی بھی رکاوٹ کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں الٹے پیروں تاریخی دیوار کی طرف لوٹ گیا۔

○ ○ ○

حجرے کے کھلے صحن کو جو سورج کے نصف النہار پر آتے ہی املتاس نیم اور کیکر کے پیڑوں کے سائے میں ڈھک جاتا، مینا نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہ اپنے لانبے ریشمی بالوں سے اسے اس قدر صاف رکھنے لگی تھی کہ لوگ جو حضور شیخ سیف الدین ملتانی کی زیارت کے لیے آتے انھیں اس صحن پر پاؤں رکھنے کی جرائت نہ ہوتی، وہ اپنے کیوڑے کے پانی، سپاری اور بتاشے کے ساتھ زینے پر ہی منتظر ہوتے۔ مگر حضور شیخ سیف الدین ملتانی کو کسی اور چیز نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ حجرے کے اندر سربسجود خدائے عزوجل کے سامنے ندامت کے آنسو بہاتے رہتے۔ بلکہ اب تو انھوں نے اس صحن پر ٹہلنا تو درکنار نکلنا ہی بند کردیا تھا۔ میں کوّے شاہ، جس نے اس حجرے کے صحن کے نیچے سائس کی ایک ویران کوٹھری کا پتہ لگایا تھا اور اس میں اپنا ٹھکانہ بنایا تھا، مجھے اپنے دن رات کچھ عجیب سے معاملات میں الجھتے نظر آتے۔ میں یہاں جانے کس امید میں سکونت پذیر تھا۔ مینا جب میرے حصے کی روٹیاں مجھے دینے آتیں تو میرے اندر اتنی ہمت نہ ہوتی کہ میں آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف تاکتا۔ مگر میرے دھڑکتے دل کے اندر مینا کی ایک ممنوعہ تصویر اب بھی قائم تھی۔ آہ وہ لذت جو ہم بے روک ٹوک تخیلات کی دنیا سے حاصل کرتے ہیں۔

''حجرے میں حضور کی آواز کا معاملہ کچھ اور ہے۔'' ایک دن مینا کی زبان کھل گئی جس سے یہ ثابت ہوگیا کہ اس کی خموشی کسی جسمانی عیب کا نتیجہ نہ تھی۔ میں دبے پاؤں

اس کے پیچھے پیچھے حجرے کے اس دریچے کی طرف گیا جس کی جالی کے اندر حضور اپنی گڑ گڑاہٹ میں مصروف تھے۔

"یا اے وہ جو فلکِ بے کنارے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کیا تیرے اس ناچیز بندے کا اس امتحان سے گذرنا لازمی تھا۔ تو نے آدم وحوا کے لیے جو امتحان طے کئے تیرے تجویز کردہ پیمبر ہوتے ہوئے بھی ان میں وہ ناکام ثابت ہوئے اور تجھے انھیں جنت بدر کر کے زمین کا خلیفہ بنانا پڑا۔ مگر یہ کیسا معاملہ ہے کہ میرے جیسے کمزور بندے کو ایک ایسے امتحان سے گذرنے پر مجبور کیا جائے جس کا وہ اہل نہیں، جس کے پاس زیر ہونے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں؟"

"یہ سب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" میں نے سر ہلا کر مینا سے کہا۔

"ان کا بچہ میری کوکھ میں پل رہا ہے۔" مینا نے مسکرا کر اپنی غلافی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "اور حضور نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے لیے تمہارا سہارا لوں۔"

"میں ہی کیوں؟" میں پیچھے ہٹ گیا۔

"کیونکہ یہ گناہ تمہارے ان گنت گناہوں کے بیچ اوجھل ہوگا۔" جالی میں حضرت شیخ سیف الدین ملتانی کا چہرا روشن ہوا اور خوف کی شدت سے ہمارے سینے کانپ اٹھے۔ حضور کی صندلی انگلیاں جالی کے سوراخوں سے نکلی ہوئی تھیں جیسے یہ جالی طائرانِ فلک کی طرح آسمان کی طرف پرواز کر جانے والی ہو اور ان سفید انگلیوں نے اسے اڑنے سے روک رکھا ہو۔" میں نے اس بچے کو اپنا نام دینے کے بارے میں سوچا، مگر مجھے اس حجرے کے تقدس کا خیال آیا۔"

"اے پاک بزرگوار، کیا حجرا انسان سے زیادہ اہم ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اور ضروری بھی، کہ تنہائی خدا کی نعمتوں میں سب سے افضل ہے۔" حضور سیف الدین ملتانی اندر کی تیرگی سے دوبارا ابھرے اور آخری بار جالی کے اندر روشن ہوئے۔

''انسان عارضی ہے، مٹی کی عمر انسان سے زیادہ ہے۔'' اور حجر استانے میں ڈوب گیا۔
اس کے بعد بھی ہم خاموش کھڑے ایک دوسرے کو تاکتے رہے۔ بلی طاقچے پر اپنے نوزائدہ بچوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ایک بچہ بار بار نیچے آنا چاہ رہا تھا جسے وہ اپنے دانتوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیتی اور طاقچے پر اپنی جگہ رکھ دیتی۔

○ ○ ○

میں اور مینا شہروں شہر گھوما کیے۔ ہم نے شیخ سیف الدین ملتانی کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ پھر وقت نے مینا کے ہم شکل بچے کے اندر حضرت شیخ سیف الدین ملتانی کے سفید رنگ کے علاوہ باقی سارے نقوش مٹا دیے۔ جب حالات اس لائق ہوئے کہ ہم درگاہوں کی زیارت کرنے نکل پائیں تو ہمارے نقشے میں شیخ کا آستانہ بھی تھا گرچہ ہمیں اس کے لیے جلدی نہ تھی۔
وادیوں اور میدانوں پر انجن کے دھوئیں کی لمبی لکیر کے نیچے ٹرینوں کے لمبے اور ان گنت سفر نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب تو کیا تھا مگر مینا کی غلافی آنکھیں ابھی اتنی وا نہیں ہوئی تھیں کہ میں ان میں خود کو دیکھ پاتا۔
شیخ سیف الدین ملتانی کافی نحیف و نزار نظر آرہے تھے۔ انھوں نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا مگر لوٹا سے پانی بچے پر چھڑکتے ہوئے انھوں نے اسے بھی وہی دعا دی جسے سب مائیں سنتی آئی تھیں۔ واپسی پر مینا نے ایک خود رو پودے کا انتخاب کیا اور اس پر دھاگا باندھ کر بچے کی لمبی عمر کی منت مانگی۔ شیخ سیف الدین ملتانی حجرے میں سجدے میں گرے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اس اچانک واقعے پر لوگ حیران و پریشان صحن پر گھوم رہے تھے جو اب چڑیوں کی بیٹ اور بلیوں اور چوہوں کی نجاست سے داغدار ہو رہا تھا۔

بعد میں واپسی کے وقت ہم لوگ تاریخی دیوار کے پاس سے ہو کر گذرے تو ایک سائکل سوار کو دیکھا جو پچھلے سات دن سے لگاتار سائکل چلا رہا تھا۔ وہ ایک جیالا نوجوان تھا، کافی لانبا اور خوبصورت۔ ایک تنبو کے سائے میں اس دن عزت ماب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی حاضر تھے اور اپنے قبائلی ناخنوں سے گنجے سر کو کھرچ رہے تھے۔ ان کے سامنے میز پر ایک چاندی کا کپ رکھا تھا۔ یہ اس تماشے کا آخری دن تھا۔

سائکل سوار پچھلے سات دن سے سائکل سے اترے بغیر سب کام کاج کر رہا تھا، غسل لینا، وضو کرنا، نماز پڑھنا۔ گرچہ ہر طرف سے کچھ سرگوشیاں بھی پھیلنے لگی تھیں کہ دیر رات جب ساری دنیا سو جاتی تھی ایک دوسرا آدمی اسی کے جیسا لباس پہنے اس کی جگہ لے لیا کرتا۔

یہ سائکل کافی پرانی تھی، بلکہ وہ کارخانہ ہی بند ہو چکا تھا جہاں یہ تیار کی گئی ہوگی۔ وہ سائکل کی کاٹھی پر بیٹھا طرح طرح کے کرتب بھی دکھاتا جا رہا تھا۔ اس نے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اپنے کپڑے بدلے، دن کا کھانا کھایا، ایک تماشبین کے ساتھ شطرنج کھیل کر اسے مات دی، اپنا سر کاٹھی پر رکھ کر دونوں ٹانگوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر کئی چکر لگائے، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے لوگوں کے سارے شبہات جو انھوں نے اس کے لیے پال رکھے تھے زائل ہو گئے۔

''میں اپنے بچے کو اس سائکل سوار کی طرح بناؤنگی۔'' مینا نے فخر سے بچے کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''اور ساری دنیا انگلی دانتوں کے بیچ دبا کر اس کی طرف تاکا کریگی۔''

○ ○ ○

دروازہ

وہ میرے بہت ہی برے دن تھے۔ میری پانچ برس کی نوکری چلی گئی تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ آئندہ کئی ماہ تک مجھے کوئی نوکری نہیں ملنے والی، بلکہ اب شاید ہی کوئی ڈھنگ کی نوکری مجھے ملے۔ میرے پاس ایک برائے نام پیشہ ورانہ تعلیم تھی جس کے دعوی دار دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔ اور ہنر کے نام پر میرے پاس چپ رہنے کے علاوہ دوسرا کوئی ہنر نہ تھا۔ جب میری میز پر تین ماہ کی تنخواہ کے ساتھ برخواستگی کا پروانہ رکھا گیا تو میں کھلی آنکھوں سے صرف اس لفافے کو دیکھتا رہ گیا جو معمول سے زیادہ دبیز تھا (گرچہ بعد میں ان میں پانچ سو کا ایک نوٹ جعلی ثابت ہوا جسے کیشیئر نے بغیر کوئی سوال کئے مودبانہ خاموشی کے ساتھ بدل دیا تھا۔) ان لوگوں نے پچھلے کئی مہینوں سے مجھے اشارے کنایے میں یہ بتانا شروع کر دیا تھا کہ کمپنی کو میری کارکردگی اطمینان بخش نظر نہیں آتی، کہ میری ریویو ہونے والی ہے۔ جب انھوں نے مجھ سے پچھلے سات برسوں کی نوکریوں کی تفصیل مانگی تو مجھے ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا اور استعفی کے بارے میں سوچنا شروع کر دینا چاہیے تھا۔ اس جگہ کام کرنے سے پہلے میں نے کئی جگہ سچ مچ کی نوکریاں کی تھیں اور کئی جگہ سے تجربات کے جعلی سرٹیفکیٹ حاصل کئے تھے جنھیں ترس کھا کر مجھے دے دیا گیا تھا۔ مگر میں نے سوچنے میں کافی وقت لگا دیا۔ اپنی خاموش طبیعت کے سبب میں نے دوسروں سے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا، نہ ہی کسی سے

کوئی رائے مانگی، گرچہ انھیں اس بات کا پتہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ میرے آفس میں تو سن گلاس واحد شخص تھا جو اکثر میری میز پر آ کر مجھ سے ایک آدھ ذاتی باتیں کر لیا کرتا۔ اسے مجھ سے دلی ہمدردی تھی۔ میں بھی اسے ناپسند نہیں کرتا تھا۔ وہ لانبے قد کا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، جس نے مشنریوں کے ایک فری اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک قبائلی کرسچن تھا جس پر یہ نام کچھ جچتا نہ تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی مگر میرے نہ چاہنے پر بھی وہ ااختصار کے ساتھ اپنے حالات مجھے بتا دیا کرتا۔ مثال کے طور پر ایک بار اس نے بتایا کہ وہ جنگل محل کے جس شہر میں پلا بڑھا اب اس کا نام بدل گیا ہے۔ واقعی، مجھے اس وقت یہ عجیب لگا تھا کہ وہ کس طرح اپنے پیدائشی شہر کی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، گرچہ بعد میں مجھے اس واقعے میں کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ دوسری بار اس نے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کیا جسے ایک تیندوا اٹھا کر لے گیا تھا۔

''وہ صرف پانچ برس کا تھا اور مجھے میرے بھائی بہنوں میں سب سے عزیز تھا۔''

''شاید اس لیے کہ وہ جلد موت کی آغوش میں جانے والا تھا۔'' مجھے خود کو بولتے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

''نہیں، اس وجہ سے نہیں۔'' ایک ہاتھ میری کرسی کی پشت پر رکھے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی قبائلی آنکھوں سے میری طرف تاک رہا تھا۔ ''اس کے آخری لمحے تک ہمیں کب پتہ تھا کہ وہ مرجانے والا تھا؟''

ہاں، میں نے اس وقت دل ہی دل میں تسلیم کیا، جسے ہم رگِ جان سے قریب رکھتے ہیں ہمیں اس وقت تک اس کی موت کا یقین نہیں ہوتا جب تک وہ مر نہیں جاتا، بلکہ اکثر تو اس کے مرجانے کے بعد بھی کئی دنوں تک ہم خود کو یقین دلا نہیں پاتے۔ ہمارا دل کہتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے اور کسی بھی وقت سامنے آ کھڑا ہوگا۔ مجھے ایک شخص

کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اپنے برسوں تک اس کا یقین نہیں کیا تھا کہ بس سے کچل کر اس کی لڑکی کی جان چلی گئی تھی گرچہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے ننھے منے جسم کو ہندوؤں کے قبرستان میں دفن کیا تھا۔ مجھے اس شخص کو دیکھنے، اس سے ملنے کی بڑی تڑپ تھی۔ یہ واقعہ میرے میس کے ایک بزرگ نے بتایا تھا جو کچھ برس پہلے ریلوے کی نوکری سے سبکدوش ہوا تھا، غیر شادی شدہ تھا، اپنی نوکری کی آخری دہائی اس نے اس میس میں گذاری تھی اور اب اس کا ارادہ اسے مرتے دم تک چھوڑنے کا نہ تھا۔

''یہ خبر اخبار میں چھپی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت پہلے میں نے اسے بنگلہ اخبار میں دیکھا تھا، مگر ان اخبار والوں کا کیا بھروسہ۔ اکثر کسی دلچسپ خبر کی کمی کو پوری کرنے کے لیے وہ جھوٹ موٹ کی خبریں بھی چھاپ دیتے ہیں۔''

''لیکن ایسا تو ہو سکتا ہے۔'' میس کے گنجے منیجر نے کہا جو ایک سنجیدہ انسان ہوتے ہوئی بھی دونوں کان کے اوپر اگے ہوئے جھالر نما بالوں کے سبب کسی مسخرے کی طرح نظر آتا تھا۔ ''ایسا ممکن تو ہے۔ کون یہ یقین کر سکتا ہے کہ اس کا جگر کا ٹکڑا مر چکا ہے۔''

اس میس میں میری نوکری چھوٹ جانے کی خبر ابھی تک نہیں پہنچی تھی اور میں آخری شخص تھا جو یہ بتانے والا تھا۔ یہ میس ایک بالکل ہی سستے ہوٹل کی طرح تھا جس کے کمروں میں چوکیاں لگی تھیں، چھوٹے کمروں میں دو دو چوکیاں اور بڑے کمروں میں چھ چھ بلکہ ایک میں تو آٹھ تخت لگے ہوئے تھے۔ اسی سب سے بڑے کمرے میں شطرنج کا بساط سجتا تھا، تاش کے پتوں کا کھیل چلتا، سیاست پر لمبی چوڑی بحثیں ہوتیں اور کرکٹ کے موسم میں ٹرانزسٹر کی آواز اونچی کر کے کمنٹری سنی جاتی۔

''اور یہی جہ ہے کہ میں اس میس کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' ریلوے کے سبکدوش ملازم نے ایک دن اعلان کیا تھا۔ ''میرے دو بھائی ہیں، ان کے بیویاں ہیں، لڑکے بچے ہیں۔ تمام لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ ہمارا آبائی مکان ہے

ذاتی تالاب اور مندر ہے۔ مگر میرا دل وہاں نہیں لگتا۔ صرف اس جگہ، اس میس میں مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں بوڑھا نہیں ہوں نہ ہی احترام کے لائق ہوں۔ صرف اس جگہ میں دل کھول کر بول اور ہنس سکتا ہوں اور لوگ میرے ریح خارج کرنے پر سنجیدگی اور احترام سے خاموش نہیں رہتے۔ صرف یہاں، تم لوگوں کے بیچ میں صحیح معنوں میں پوری طرح زندہ ہوں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس میس میں اس جیسے بوڑھے سے لے کر کئی ادھیڑ عمر اور مجھ جیسے پختہ عمر کے لوگوں کے علاوہ کالج اور ہائی اسکول کے طلبا بھی رہتے تھے۔ ان میں سے چند بستر پر کچھ لوگ کافی عرصے سے قابض تھے اور کچھ بستروں پر رہنے والے بدلتے رہتے جن میں زیادہ تعداد طالب علموں کی ہوتی کیونکہ یہاں چاروں طرف ہائی اسکول اور کالج بکھرے پڑے تھے۔

ہمارا بوڑھا میس کے اندر کافی مقبول تھا۔ ایک بار وہ شدید طور پر بیمار پڑا تو نہ صرف اسے سب لوگوں نے سرکاری اسپتال میں داخل کیا بلکہ اسپتال سے واپسی پر رات رات بھر جاگ کر اس کی تیمارداری بھی کی۔ وہ تاش کا ایک اچھا کھلاڑی تھا اور اکثر لوگوں کو جوا کھیلنے پر اکسایا کرتا۔

''پیسہ نہ لگاؤ تو کیا خاک مزا ہے۔'' وہ کہتا۔'' چاہے وہ زندگی کا کھیل ہی کیوں نہ ہو۔ سارا کچھ پیسوں کے بل پر چلتا ہے۔ یقین نہ ہو تو ایک بار پیسہ پھینک کر دیکھو۔''

میں نے کئی بار تاش میں اسے ہرایا تھا۔

''مجھے حیرت ہے۔ تم کوئی اچھے کھلاڑی تو ہو نہیں۔'' اس نے بعد میں مجھ سے کہا ۔'' ایک بار جیت لینا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن ہر بار جیتنا وہ بھی ایک ایسے کھلاڑی کے لیے جسے صحیح ڈھنگ سے پتے سنبھالنا تک نہیں آتا، یہ میری عقل سے باہر ہے۔ واقعی تم کس مٹی سے بنے ہو؟ اور تم اتنے خاموش انسان کیوں ہو؟ کیا راز ہے جو تم اپنے سینے میں

ڈھوتے پھر رہے ہو۔ بچے، تمھارے گھر میں سب ٹھیک تو ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے سینے میں کوئی راز دفن نہیں ہے اور میں خاموش کیوں رہتا ہوں، میں خود نہیں جانتا۔ اور میرا گھر اور دوسرے گھروں سے الگ نہیں ہے۔

"شاید تمھاری خاموشی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ ممکن ہے ہم لوگ ہی اپنی زبان کا زیادہ استعمال کرتے ہوں۔" اس نے آخر کار ہار مانتے ہوئے کہا اور اس کے بعد ایک طرح سے میری خاموشی کو تسلیم کر لیا۔

○ ○ ○

ہر صبح ساڑھے نو بجے نہا دھو کر، مچھلی بھات کھا کر میں میس سے نکل پڑتا۔ میرا رخ ہمیشہ کی طرح اپنے آفس کی طرف ہوتے ہوئے بھی اگلے ہی موڑ پر میں کسی انجانی جگہ کے لیے نکل پڑتا جس کا مجھے اس وقت تک پتہ نہ چلتا جب تک میں اس جگہ پہنچ چکا نہ ہوتا، مگر اس جگہ پہنچ جانے پر مجھے ایسا لگتا جیسے میں وہیں کے لیے نکلا تھا۔ زیادہ تر وقت سڑک پر چلتے چلتے میں خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ زندگی یہی ہے، اور دنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے، رک رک کر، بدل بدل کر، جس طرح ہر انسان ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہوئے بھی ایک جیسا ہی ہوتا ہے، اسی طرح تمام انسانی زندگیاں بظاہر الگ الگ ہوتے ہوئے بھی بالکل ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر آج اگر میں ایک بے مقصد آوارہ انسان بن چکا ہوں تو میں اس شخص سے قطعی طور پر الگ نہیں ہوں جو تیز قدموں کے ساتھ اپنے سائے کا تعاقب کرتے ہوئے ایک خاص وقت میں کہیں پہنچنا چاہتا ہے۔ دن کے خاتمے پر جب سورج اونچی عمارتوں کے درمیان ننگے پیڑوں کے پیچھے جا رہا ہوگا تو وہ ایک بار پھر اسی راستے پر واپس اپنے سائے کا تعاقب کرتا دکھائی دیگا، پہلے کی طرح ہی کپڑوں میں ملبوس اور

زندہ۔ اور اس وقت میس کی طرف واپس لوٹتے ہوئے (میں اس کا خیال رکھتا کہ یہ آفس سے لوٹنے کا وقت ہو) وہ مجھ سے کچھ الگ نہ ہوگا۔ اگر میں ایک گاؤں یا ایک چھوٹے شہر میں ہوتا تو یقیناً پکڑا جاتا، مگر ایک بڑے شہر میں چھپنے کے ہزاروں مواقع ہوتے ہیں۔ آپ اپنے گھر کے باہر ایک دوسرے انسان میں ڈھل جاتے ہیں جسے کوئی نہیں جانتا۔ اور اسی طرح ہر روز آپ بے نام لوگوں کی بھیڑ میں کسی ناؤ سے ٹوٹے ہوئے تختے کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں، بالکل تنہا اور خاموش۔ لیکن یہ شہر اگر ایک پر شور سمندر ہے تو ہمارا میس کسی پر سکون جزیرے سے کم نہیں، جہاں چڑیوں کی چہچہاہٹ ہے، کلبلاتے جھرنے ہیں اور ایک عجیب طرح کی طمانیت لوگوں کے چہروں میں نظر آتی ہے۔ کیا یہ اپنے گھر کی روز مرہ کی پریشانیوں سے دور رہنے کا نتیجہ تھا؟ واقعی یہ ایک عجیب طلسماتی جگہ تھی جہاں آپ کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ آپ موجوں کے تھپیڑوں کے بیچ ایک ٹوٹے ہوئے تختے کی طرح بہتے جا رہے ہیں جس کی کوئی سمت یا منزل نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی خاموشی کی چادر اوڑھے ہوئے بھی آپ اس جگہ کے شور وغل کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ان ہی آوارہ گردی کے دنوں میں، جب میں دھیرے دھیرے اپنی جمع کی ہوئی پونجی ختم کر رہا تھا اور میرے والدین حیران تھے کہ میں گھر کیوں نہیں لوٹتا، میری ملاقات ایک عجیب انسان سے ہوگئی جس کی ہڈیوں کے گودوں میں چربی کی جگہ شراب دوڑتی تھی۔ وہ کبوتروں سے ڈھکا ہوا ایک روشن دن تھا اور عمارتوں کی دورویہ دیوارِ چین کے بیچ شاہراہ پر راہگیروں کا ہجوم اپنے معمول پر تھا جب میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک ہائڈرنٹ کے پیچھے سر ڈالے اسے دھو رہا تھا۔ اس نے ابھی ابھی فٹ پاتھ کے ریلنگ کو تھام کر نالے کے اندر قئے کی تھی۔ دراصل یہ اس کی حلق میں انگلی ڈال کر ڈکرانے کی آواز ہی تھی جس نے میرے قدم روک لیے تھے۔

جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا کہ میں نے جھک کر اس سے پوچھ لیا کہ وہ ٹھیک تو ہے۔

اس نے اپنا گیلا چہرا اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے بال پیشانی سے چپکے ہوئے تھے، آنکھیں سرخ۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ مجھے نہیں جانتا، اس نے اعلان کیا اور دوبارا پانی کی موٹی دھار کے نیچے اپنا سر ڈال دیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنا سرا اچھی طرح دھولیا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جیب سے رومال نکال کر سر اور چہرا صاف کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

آج اس نے بہت زیادہ پی لی تھی، اس نے مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر بتایا۔ میرے اندر کسی طرح کے ردِ عمل کا فقدان پا کر اسے کوئی مایوسی نہیں ہوئی تھی، جیسے وہ ان چیزوں کا عادی ہو۔ کسی نے اسے ایک بہت ہی سستے شراب کے اڈے کا پتہ بتایا تھا، جو شہر کے بیچوں بیچ ایک گراج کے اندر واقع تھا۔ اسے یہ جگہ پسند آئی تھی۔ یہ ایک طرح سے مفلوک الحال لوگوں کی جنت تھی۔ یہ کبھی ایک مشہور گراج رہا ہو گا مگر اب دارو کے ایک اڈے میں بدل چکا تھا جہاں دیسی اور انگریزی دونوں پانی کے بھاؤ ملتی تھیں۔ ''جب شراب اتنی سستی ہو اور آدمی تنہائی کا شکار تو وہ ضرورت سے زیادہ پی لیتا ہے اور خالی پیٹ شراب پیو تو بعد میں پیٹ کے اندر چوہے دوڑنے لگتے ہیں۔ وہاں کھانے کی الم غلم چیزیں بک رہی تھیں، ہر طرح کی ابلی اور تلی ہوئی چیزیں جنھیں یہ چوہے خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔ شاید مجھے اپنی عمر کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔''

مجھے لگ رہا تھا میں نے خوامخواہ ہی اس شخص کے ساتھ خود کو الجھا لیا تھا۔ میں اس سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا جب اس نے اپنا گیلا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میرا کندھا اس کی ہتھیلی کے نیچے لاشعوری طور پر کسمسا اٹھا۔ اس کے وجود سے قئے کی

مہک آ رہی تھی۔ اس نے واقعی بہت بری طرح کھایا تھا۔

''تم شراب پیتے ہو؟''

میں نے اسے بتایا کہ میرے جیسے قلیل آمدنی والے لوگ بھی کبھی کبھار شراب پی لیا کرتے ہیں۔

اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے پینا چاہئے۔ یہ انسان کو ایک مشین بننے سے روکتی ہے۔ ضروت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی بغاوتیں جاری رکھیں۔ ہمارے زندہ رہنے کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

میں اس کی بے سر پیر کی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے مسکرا کر میرا کندھا تھپتھپایا۔ قئے کرنے کے بعد اس کا نشہ تھوڑا کم ہو گیا تھا۔ اس کی طبیعت بھی سدھرنے لگی تھی۔ ''اور تم کام کیا کرتے ہو؟ کہیں میں تمھارے ذاتی معاملات میں ضروت سے زیادہ دخل تو نہیں دے رہا ہوں؟''

میں نے اسے بتایا کہ میں ان دنوں بیکار ہوں، کہ میری نوکری چلی گئی ہے۔

''کام ڈھونڈ رہے ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بتایا کہ ابھی میں نے اس کے بارے میں سوچا نہیں ہے۔

''تب تو تم زندگی کے سب سے سنہرے دور میں ہو۔'' وہ ریلنگ کو تھامے کھڑا تھا اور سڑک پر راہگیروں کی نہ ختم ہونے والی بھیڑ کی طرف دیکھ رہا تھا جو سب وے سے امڈی چلی آ رہی تھی۔ ''شہر کی سیر کرو، سٹی سینٹر کی طرف جاؤ، کسی آرٹ میوزیم میں وقت برباد کرو یا پھر دریا کو اپنے کنارے کا کوڑا کرکٹ کھاتے دیکھو، اور اگر ان سب چیزوں سے جی نہ بہلے تو میرے جیسے شرابیوں کو قئے کرتے تو دیکھ ہی سکتے ہو۔ واہ کیا لاجواب زندگی ہے تمھاری۔ اور یہ کتنے دنوں چلنے والا ہے؟''

میں نے معذرت چاہی۔

''کہاں جاؤ گے تم؟ تمھارے پاس جانے کے لیے کوئی جگہ تو ہے نہیں۔ سورج کے ڈوبنے تک تمھیں ان ہی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنی ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نہ میں۔ تم سر نہ ہلاؤ تو بھی میں جانتا ہوں معاملہ یہی ہے؟''

میں اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔

اس نے اوور برج کے پیچھے ٹن کے ایک بڑے سے کتھئی رنگ کے شیڈ کی طرف اشارا کیا جس پر پرانے زمانے کی ایک چمنی کھڑی تھی۔ لگ رہا تھا چمنی سے دھواں نکلے زمانہ ہو چکا تھا۔ شاید یہ کسی طرح کا سرکاری گدام تھا کیونکہ اس کی نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ اس اتنی بڑی دیوار پر کسی نے چے گیوارا کا بڑا سا پوسٹر چپکا رکھا تھا جس کا نچلا سرا دھوپ اور پانی میں سڑ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہاں، اس گدام کے پیچھے اینٹ کی ایک دو منزلہ پرانی عمارت کے اندر اسکا ٹھکانہ ہے اور اگر چاہوں تو میں تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ گذار سکتا ہوں۔ ''میرے پاس شراب کی ایک بوتل اب بھی بچی ہوئی ہے۔ ویسے کسی اجنبی کے ساتھ اس طرح ہو لینے کا مشورہ میں بھی نہیں دونگا۔ تم مصیبت میں پڑ سکتے ہو۔''

وہ شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا؟

''مجھے لگتا ہے مجھے واپس جانا چاہئے۔'' ایک اکتا دینے والی خاموشی کے بعد میں نے احتجاج کا رویہ اپناتے ہوئے کہا۔

''سوچ لو۔'' اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ قائم تھی۔ ''یہ شہر ایک اور دروازہ تمھارے لیے کھول رہا ہے۔ شاید یہ تمھاری بوریت بھری زندگی میں تھوڑی سی رونق لے آئے۔ یا ساری زندگی یوں ہی گذار دینا چاہتے ہو، بے مقصد، آوارہ، کسی مشین کی طرح کسی اور کیلئے جو تمھارا شکر گذار بالکل نہ ہوگا۔''

میں نے اسے بتانا چاہا کہ یہ اتنا برا بھی نہیں تھا، کہ زندگی ان ہی کل پرزوں کے سہارے چلتی رہتی ہے۔ مگر کیا میں اس کا اہل تھا کہ انھیں الفاظ کی شکل دے سکتا۔

○ ○ ○

میں دیر سے میس لوٹا تھا۔

''آج آفس میں کام زیادہ تھا؟'' میرے پڑوسی نے راہداری کے بیسن پر چہرا دھوتے دھوتے آئینہ کے اندر سے میری طرف دیکھا۔ اس نے ابھی ابھی اپنی شیونگ ختم کی تھی۔ میرا دروازا بیسن سے لگا ہوا تھا۔ کنجی نکالتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ میری نوکری ایک ماہ قبل جا چکی ہے۔ میں اس سے بالکل قریب نہ تھا، بس کمرا آس پاس ہونے کے سبب کبھی کبھار ہماری ملاقات ہو جاتی۔ مگر جانے کیوں وہ راز جسے میں نے سب سے چھپا کر رکھا ہوا تھا اتنی آسانی سے اس کے سامنے اگل دیا۔ میرے کمرے میں دو بستر تھے۔ میرا روم میٹ بہت دیر سے واپس لوٹنے کا عادی تھا۔ ایک پرائیوٹ فرم اس کا استحصال کرتی تھی۔

وہ میرے پیچھے پیچھے شیونگ کا ڈبہ تھامے کمرے کے اندر آ گیا اور دوسری چوکی پر بیٹھ کر جس کا بستر تکیہ کے گرد لپیٹ کر ایک کنارے رکھ دیا گیا تھا، چھت کے کنڈے سے لٹکتے بلب کی تیز روشنی میں میرا جائزہ لینے لگا۔ اس نے گیلا چہرا صاف نہیں کیا تھا گرچہ تولیہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ میرا چھوٹا سا کمرا آفٹر شیونگ لوشن سے مہک اٹھا۔

''کوئی دوسری نوکری ڈھونڈ رہے ہو؟''

اس کا جواب دینے کی بجائے میں بستر سے اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا جسے میں صبح پڑھ کر نکلا تھا اور اب دوبارا پڑھنے والا تھا۔ میں نے اس سے التجا کی کہ میری نوکری کے بارے میں دریافت نہ کرے۔

''تم تھوڑا نشے میں لگ رہے ہو؟''

ہاں، میں نے اسے بتایا، میں نے ایک بے غیرت انسان کی شراب پی ہے جو خود کو سماج کا ناسور سمجھتا ہے۔

''تو ان دنوں یہ کر رہے ہو۔'' اس نے تولیہ سے چہرا رگڑتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر برص کے نشان نمایاں ہو چلے تھے۔ ''چلو، جب تک نوکری مل نہیں جاتی اس شہر کو چھان پھٹک لو۔ ایک بڑا شہر اپنے آپ میں کسی عجائب گھر سے کم نہیں ہوتا۔''

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک اس عجیب وغریب انسان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا دبیز دیواروں والا پرانا گھر ایک ڈھلان پر واقع تھا جس کی اوپر کی منزل پر جانے کس طرح کے لوگ آباد تھے۔ اس نے جس کمرے میں مجھے بٹھایا اس کا ایک دروازہ نہر کی طرف کھلتا تھا جو اب گندے پانی کے ایک بڑے نالے کی شکل لے چکی تھی۔ دروازے کے باہر ایک ٹوٹا پھوٹا زینہ تھا جس کا آخری پائدان ٹوٹ جانے کے سبب زمین سے اس کا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ سیڑھی کے نیچے جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلان تھی جس پر شراب کی رنگ برنگی بوتلیں پانی کے اندر تک بکھری ہوئی تھیں۔ نہر کے دوسرے کنارے ریفوجیوں نے سرکنڈوں کے کے جھونپڑے بنا رکھے تھے جن کے چھپر کھجور کے پتوں کے تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر پولیتھین سے گھرے ہوئے سنڈاس پانی میں اپنے طوالوں پر کھڑے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر جھونپڑیاں ویران تھیں کیونکہ ریفوجیوں کی ایک بڑی تعداد ملک کی آبادی میں رچ بس گئی تھی۔ یہ جھونپڑیاں نہر کے دنوں کنارے اتنی دور تک چلی گئی تھیں کہ ان کا آخری سرا دھند میں غائب ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے شہر کے عین مرکز میں اتنی لمبی اتنی خوابناک نہر کو دیکھنے کا اس سے پہلے اتفاق نہیں ہوا تھا، وہ بھی ایک ایسی جگہ جس سے تھوڑے ہی

فاصلے پر دنیا کا ایک مصروف ترین ریلوے اسٹیشن واقع تھا۔

''تمھاری آنکھوں سے لگتا ہے اس نہر کو پہلی بار دیکھ رہے ہو۔'' اس نے ایک بہت ہی پرانے چرمی صوفے کی طرف اشارا کیا جس کے آدھے حصے پر پرانے اخبارات، گندے کپڑے اور دوسرے الم غلم سامان بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔ میں اس کمرے میں اپنی دلچسپی کے لائق کوئی چیز تلاش کر رہا تھا، ایسی کوئی چیز جو اس انسان پر روشنی ڈال سکے۔ ہم جن سامانوں کے درمیان زندگی گذارتے ہیں کیا وہ ہمیں ہم سے بہتر بیان نہیں کرتے؟ مگر مجھے کہیں پر کچھ بھی دکھائی نہ دیا یہاں تک کہ پلستر جہاں جہاں سے اکھڑ گئے تھے وہاں بھی کوئی انسانی ہیولا بن نہیں پایا تھا۔ کیا اس نے اپنی زندگی سے تمام مفاہیم کو جلاوطن کر دیا تھا؟

''زیادہ تر لوگ واپس اپنے اچھے دنوں میں جینا چاہتے ہیں۔'' اس نے لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور چونکہ وہ نہیں جانتے اچھے دن کیا ہوتے ہیں انھیں اچھے دنوں کی کہانی بنانی پڑتی ہے۔''

''اور وہ لوگ جنھوں نے سرے سے اچھے دن نہیں دیکھے؟''

''تم نے کبھی بازار سے آلو خریدا ہے؟'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''صبح سے شام تک ایک ہی ڈھیر سے لوگ آلو چنتے رہتے ہیں اور تمام آلو بک جاتے ہیں۔ کیوں؟ کیا اس ڈھیر میں سڑے گلے آلو نہ تھے؟ قدرے کم سڑے گلے آلو بھی نہ تھے؟ دراصل ہم ان ہی دنوں سے اپنا اچھا دن چنتے ہیں جو ہمارے پاس ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کی زندگی میں برے دن ہی طئے کرتے ہیں کہ ان کے اچھے دن کون سے تھے۔''

''اس طرح دیکھا جائے تو ہماری زندگی میں کوئی بھی اچھا دن نہیں ہوتا۔''

''نہ ہی برا دن۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اور دونوں کے درمیان بہت

زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔"

"کیا آپ ہمیشہ سے اسی طرح اکیلے رہتے آئے ہیں؟"

نہیں، اس نے ایک المونیم کی ڈبیا کھول کر بیڑی نکالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ اگر میرا مطلب اس عمارت سے ہے تو مجھے جان لینا چاہئے کہ اس بلڈنگ میں کچھ خاص نہیں ہے۔ اسے تو زمانہ ہوا ریلوے کنڈم ڈیکلیئر کر چکی ہے۔ بس تھوڑے سے ہی لوگ بچے ہیں اس میں، اس کے جیسے گھس پیٹھیے جنھیں میں شہر کی گاد بھی کہہ سکتا ہوں۔ ہاں گاہے بگاہے یہاں جرائم پیشہ افراد پناہ لیتے رہتے ہیں، رات کے وقت اوپر کے ایک کمرے میں شراب کی ایک غیر قانونی دکان کھل جاتی ہے، کچھ کمروں میں بیسوائیں اپنا دھندا چلاتی ہیں جو دن کے وقت جو دن کے وقت جانے کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ کوئی بلاوجہ نہیں کہ پولس کا یہاں آنا روز کا قصہ ہے جن میں بہت سوں کے ساتھ اس کی دوستی بھی ہو چکی ہے۔ مگر شاید میں نے اس کے اکیلے پن کی بات کہی تھی۔ نہیں، کبھی اس کی بھی ایک دنیا تھی جہاں رشتوں کی بھول بھلیاں تھیں، بچوں کی چہکاریں تھیں اور تعلقات کی چور زمینوں پر وہ بھی اور دوسرے لوگوں کی طرح چلنے کا عادی تھا۔" مگر جب تم ایک کے بعد ایک نوکری کھونے لگتے ہو تو دھیرے دھیرے تم اکیلے ہو جاتے ہو۔"

ممکن ہے اسے اکیلا پن پسند ہو، میں نے اپنی رائے دی۔

اس دنیا میں کون اکیلا ہے؟ وہ ایک ٹک کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں آسمان کا کوئی رنگ نہ تھا۔ وہ ان پرچھائیوں کا کیا کرے جو اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں؟ ابھی کچھ دن پہلے تک اس نے ایک چھاپے خانے میں نوکری کی تھی۔ عجیب عمارت تھی وہ، دقیانوسی دروازے، غیر ضروری طور پر اونچی کھڑکیاں، کالکھ سے ڈھکی دیواریں، ستون جیسے مردہ انسانوں کی آتمائیں سر جھکائے کھڑی ہوں۔ اس کی راہداریاں کسی مقبرے

کے تہہ خانے کی یاد دلاتی تھیں۔کون یقین کر سکتا ہے، اس دنیا میں ایسی جگہیں بھی ہیں۔مجھے اس جگہ کو دیکھنی چاہیئے۔ ''تم یقین نہیں کروگے، اس چھاپے خانے میں داخل ہونے سے پہلے انسان کو اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔''

کیا وہ چاہتا ہے کہ میں اس کی باتوں کا یقین کرلوں؟ اور اس نے وہ جگہ کیوں چھوڑی؟ وہ جو کچھ بتا رہا تھا یہ تو اس کی وجہ نہیں ہو سکتی۔دنیا میں اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز چیزیں موجود ہیں۔

شاید میں ٹھیک کہہ رہا تھا، اس نے کہا۔شاید وہ اب کسی کام کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔شاید اس نے بہت پہلے اپنے آپ کو ایک پیراسائٹ میں بدل دیا تھا۔تو ایک دن اس نے خود سے سوال کیا، وہ اس جگہ کر کیا رہا ہے؟ اور اس نے وہ نوکری چھوڑ دی۔میں چاہوں تو اس کی جگہ لے سکتا ہوں۔اس کے تعلقات آج بھی ان لوگوں سے برے نہیں ہیں۔

یہ کتنا آسان ہے، اپنے آپ کو پیراسائٹ قرار دینا۔جب کہ یہ سارا سماج ہی پیراسائٹ کے ایک دشوار گذار جنگل میں بدل چکا ہے۔اور میں نے اس سے کہا کہ وہ غلط سمجھ رہا ہے۔کیا میں نے ابھی تھوڑی دیر قبل نہیں بتایا تھا کہ میں نے ابھی کوئی نوکری ڈھونڈنے کے بارے میں سوچا نہیں ہے۔

''جو ثابت کرتا ہے کہ بہت جلد تم ڈھونڈنا شروع کردوگے۔'' وہ اپنی ناک سے ہنسا۔''ایک کتا ہڈیوں کے بغیر کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔''

وہ ایک میز کی طرف گیا جس پر دوائیوں کی شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔اس نے اس کا داہنا دراز باہر کی طرف کھینچا اور اس سے ایک اخبار کا مڑا تڑا صفحہ نکال کر میری طرف پھینک دیا۔اس پر اور دوسرے اشتہاروں کے ساتھ ساتھ ایک چھاپے خانے کا اشتہار بھی تھا جس کے گرد نیلی روشنائی سے دائرہ بنا دیا گیا تھا۔

○○○

میری نوکری لگے یہ دوسرے مہینے کا آٹھواں دن ہے۔ اسی درمیان میں نے شہر کے سب سے بڑے ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ کا رخ نہیں کیا ہے جہاں میں ایڈز کی روک تھام کرنے والی ایک تنظیم کا رکن ہوں۔ اپنے کام کے دوران میری کئی طوائفوں سے اچھی جان پہچان ہوگئی ہے۔ یہ مجھے پسند کرتی ہیں اور انھیں اس پر حیرت ہوتی ہے کہ میں ان کے ساتھ سوتا کیوں نہیں۔ ان میں سے کئی کے میں نے بینک میں کھاتے کھلوائے ہیں، کچھ کے خطوط لکھ دیا کرتا ہوں، کتنیوں کے میں نے پین کارڈ بنوا دیے ہیں، جن کے ریٹرن اپنے ایک وکیل دوست کی مدد سے ہر سال بھر دیا کرتا ہوں اور ایک ایسی طوائف بھی تھی جس کے دونوں پستان سرجنوں نے کاٹ دیے تھے مگر اس کے سرطان کو پھیلنے سے روک نہیں پائے۔ اس کی موت کے وقت میں واحد شخص تھا جو اس کے سرہانے موجود تھا۔ دراصل یہ سب کچھ میں کسی نیک مقصد سے نہیں کرتا تھا۔ میں جب اپنے ایک دوست کے ساتھ پہلی بار اس جگہ گیا تو میرا مقصد نیک بالکل نہ تھا۔ اس کے بعد بھی میں کئی بار وہاں گیا، مگر ایک دن میں نے ایک بہت ہی کمسن لڑکی کو، جسے ابھی سن بلوغ تک پہنچنے میں کئی سال باقی تھے، ایک بھاری بھرکم دروازے کے نیچے زمین پر اکڑوں بیٹھے گاہکوں کا انتظار کرتے دیکھا اور میں حیران رہ گیا۔ لکڑی کا یہ مضبوط دروازہ، جس میں بے شمار کیلیں جڑی ہوئی تھیں، جو جانے کب سے اس جگہ کھڑا تھا، خود اس کمسن لڑکی کا ایک اٹوٹ حصہ نظر آرہا تھا جیسے وہ اس دروازے سے باہر آئی ہو۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی دروازے کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا، مگر وہ دروازہ اس دن سے لگاتار میرے خواب میں آنے لگا۔ مگر وہ میرے خواب میں اکیلا نہ آتا، ہر بار کوئی نہ کوئی طوائف اس سے لگ کر کھڑی یا

بیٹھی نظر آتی جیسے دونوں ایک دوسرے سے لازم وملزوم ہوں، اور یہ طوائف جو بھی ہوتی، چاہے اس کی عمر کچھ بھی رہی ہو، اس کا چہرا اسی کمسن لڑکی کا چہرا ہوتا۔ اس دن کے بعد میں جب بھی وہاں گیا، میری توجہ ان پرانی کھنڈر نما عمارتوں کے دروازوں پر بھٹکتی رہتی کیونکہ ان طوائفوں کی طرح میرے لیے وہ بھی جیتی جاگتی چیز بن گئے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ کمسن لڑکی اور وہ دروازہ مجھے پھر کبھی دکھائی نہ دیے، یا شاید میں نے انھیں گڈ مڈ کر دیا تھا۔ آج جب میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو جانے مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ اگر میں اس دن اس دروازے کو نہ دیکھ پاتا تو شاید سستے میک اپ سے لپی پوتی ان مورتیوں کے پیچھے چھپی عورتیں میرے سامنے کبھی کھل نہ پاتیں۔ یہ دروازے جن کی لکڑیاں گھنے اور تاریک جنگلوں سے لائی گئی تھیں اور یہ لڑکیاں جو نیپال کے پہاڑوں اور چھتیس گڑھ کے تاریک جنگلوں سے لا کر ان تنگ و تاریک کوٹھریوں میں ڈال دی گئی تھیں، کتنا عجیب رشتہ تھا ان دونوں کا، ان دونوں کو ایک دوسرے کے اندر دیکھنا کتنا آسان تھا۔ اس دن مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ ہر دروازے کی اپنی ایک الگ کائنات ہوتی ہے جو اس کے اندر اور باہر دونوں طرف پھیلی ہوتی ہے۔ ان دروازوں سے گذرتے وقت ہمیں کبھی اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ ہم ایک اجنبی کی طرح اس کائنات میں داخل ہوتے ہیں، ایک اجنبی کی طرح اس سے باہر جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔

مگر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے ایک اور دروازہ ہے جو شدت سے میرا انتظار کر رہا ہے۔ کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس نئی کائنات میں داخل ہو جاؤں۔ شاید وہاں مجھے اپنے اندر کا وہ انسان مل جائے جس کی تلاش میں میں اتنا سرگرداں ہوں۔

آج میں نے دسویں بار چھاپے خانے کے اشتہار کو پڑھا ہے۔ اس پر دیے گئے فون پر مجھ سے کہا گیا ہے کہ ایک خاص جگہ سب وے میں اترنے کے بعد مجھے کچھ

دور چلنا ہوگا، وہاں مجھے ڈھلائی لوہے والی ایک چکر دار سیڑھی دکھائی دیگی جس کے نیچے ایک یک چشم بھکاری جاپانی افزائش جنسی آلہ کے ایک بڑے سے گھناؤنے پوسٹر کے نیچے کھڑا ملے گا۔ یہ چکر دار سیڑھی ایک لکڑی کے دروازے پر ختم ہوگی جس کے اندر ایک دوسری سیڑھی میری منتظر ہوگی جس کے خاتمے پر شہر دوبارا نیلے آسمان کے نیچے دکھائی دے گا۔

فٹ برج سے گذر کر زینہ اترتے ہوئے میں نے سوچا جب سب وے سے واپس اوپر آنا ہی ہے تو کیوں نہ اوپر ہی اوپر اس عمارت کی تلاش کی جائے۔ یہ میری غلطی تھی۔ ذیلی سڑکوں اوران سے منسلک گلی کوچوں میں اس کے آس پاس کے نمبر کے کئی چھوٹے بڑے مکانات نظر تو آرہے تھے مگر کہیں پر اس کمپنی کا نام یا اس کی عمارت کا نمبر مجھے دکھائی نہ دیا نہ ہی ایسی کوئی قدیم عمارت نظر آئی جس کی گنبد آسمان کو چھو رہی ہو۔ وہاں ہر کوئی مجھے سب وے کی راہ دکھا رہا تھا۔ آخر کار مجھے ہتھیار ڈالنا پڑا۔

اس زمین دوز راستے میں اترنے کے لیے مجھے اسٹیشن کے داخلے کی طرف جانا پڑا جہاں سبزی منڈی میں چھکڑوں، رکشا وین اور انسانوں کی بے پناہ بھیڑ کے درمیان راستہ نکالنا ایک انتہائی مشکل کام تھا۔ یہ افراتفری سرنگ کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں اندر کی بدبو اور نیم تیرگی میں آگے بڑھ رہا تھا جب میں نے اپنے ایک ہم شکل انسان کو دیکھا۔ وہ میری طرح ہی ناک پر رومال ڈالے چل رہا تھا۔ وہ نہ صرف میری عمر کا تھا بلکہ اس کے بالوں کی تراش بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب ویرانی تھی جو کسی فرضی بلیک ہال کی طرح آس پاس کی روشنیاں پی رہی تھیں۔ میری ہی طرح اسے کہیں پہنچنے کی جلدی تھی یا شاید وہ اس بدبودار سرنگ سے جلد سے جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میرے دل نے کہا کہ وہ میرا آدمی ہے، کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔ شاید اسے بھی میری بات کا پتہ چل گیا تھا

کیونکہ اس نے اپنی رفتار دھیمی کر لی تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم اس زمین دوز گذرگاہ میں بہت اندر تک چلے آئے جہاں دیوار سے نکلے ہوئے بلب اپنے سفید ڈھکنوں کے نیچے سے یرقان زدہ روشنیاں دونوں طرف کی دیواروں پر ڈال رہے تھے۔ جگہ جگہ چھت سے پانی رس رہا تھا جس نے نیچے اتر کر بدرووں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ شاید تھوڑی دیر قبل سرنگ کے اندر بلیچنگ پاؤڈر کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا کیونکہ اس کی تیز مہک میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

''تم ضرورت سے زیادہ تیز چل رہے ہو۔'' کسی نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ میں نے اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر روشنی اور تیرگی کی آنکھ مچولی کے درمیان وہ مجھے دکھائی نہ دیا۔ دوسرا آدمی ایک بلب کے نیچے رک گیا تھا۔ اس کا سایہ دیوار پر اس طرح ترچھا گر رہا تھا کہ اس کی ناک لمبی ہو گئی تھی۔

''مبارک ہو!'' میرے قریب پہنچنے پر اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کس لیے؟''

''کیونکہ تم صحیح راستے پر ہو۔''

''شاید آپ نے بھی وہ اشتہار پڑھا ہے۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ اسی شخص کا دیا ہوا ہے جس نے مجھے یہ دیا ہے۔''

''ممکن ہے یہ وہی آدمی ہو۔'' اس نے اپنی جیب سے وہی اشتہار برامد کیا جو میرے پاس تھا۔ میں نے دیکھا چھاپے خانے کے اشتہار کے گرد نیلی روشنائی سے ہو بہو ویسا ہی ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ ''ویسے ہمیں ایک دوسرے کو کسی طرح کی صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ اور یقین کرو میں خود کو اس طرح کے حالات کے لیے تیار کر ہی رہا تھا جب یہ ہو گیا۔'' اور اس نے چکردار سیڑھی کی طرف اشارا کیا جس کے نیچے ایک لحیم شحیم بھکاری اپنی ایک آنکھ کے ساتھ کھڑا تھا۔

"انسانیت کی خاطر، آپ پہلے۔" اور وہ تیزی سے مڑ کر سرنگ کے اندر غائب ہو گیا۔
یہ اچانک ہوا تھا جس کے لیے میں تیار نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا، میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا ممکن ہے وہ مجھے انسان نہ رہنے دے، ساری زندگی کے لیے ربر کے ایک ہوے میں بدل دے۔ مگر ان حالات میں میرے پاس کرنے کے لیے کیا بچا تھا؟

"میں پچھلے ایک ہفتے سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس سیڑھی تک آتا ہے مگر پھر واپس چلا جاتا ہے۔" یک چشم بھکاری نے اپنی بن مانگی رائے دی۔ وہ ایک بلب کی بھرپور روشنی میں کسی دیو کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے کان کے نیچے ورم کا ایک بڑا سا نشان تھا۔

"کیا تم دیکھ نہیں پائے کہ وہ میں ہی تھا؟" میں نے ایک سکہ اس کے کٹورے میں ڈال کر لوہے کی سیڑھی کی طرف قدم بڑھایا۔ لوہے کی سیڑھی طئے کرتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا ہمزاد کسی کونے میں کھڑا مجھے ضرور دیکھ رہا ہوگا۔ مگر میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہ تھا کہ اسے نظرانداز کر دوں۔ پھر بھی خیر سگالی کے جذبے کے ساتھ میں نے اسے آواز دی۔

"دوست، میں تمھارے ہی راستے پر چل رہا ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو یہ اتنا مشکل نہیں ہے۔ کیا میں تمھارا انتظار کروں۔"

سرنگ کے اندر اتنا سناٹا تھا کہ چھت سے ٹپکتے پانی کے قطروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

سیڑھی کی بلندی سے میں نے نیچے نظر ڈالی۔ سرنگ سے تمام راہگیر جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مجھے نیچے سے بھکاری کی بلغمی ہنسی سنائی دی۔

"وہ اب یہاں کبھی نہیں آئے گا۔" اس کا چہرا روشنی میں تیرتا ہوا اوپر کی طرف آیا۔
وہ میرے سکے کو اٹھا کر بلب کی روشنی میں شبہ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ "میں ان لوگوں کو

اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہمارے کاسے میں کھوٹا سکہ ڈالتے ہیں۔"

○ ○ ○

چکر دار سیڑھی لکڑی کے ایک دروازے پر ختم ہوتی تھی جس کے اندر کنکریٹ کی ایک اور سرنگ نما سیڑھی تھی جو بتدریج بلند ہوتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے اوپر سے مشینوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یہ وہ آوازیں تھیں جو شہر کو فعال رکھتی تھیں۔ یہ سیڑھی مجھے ایک بڑے سے ہال کے اندر لے گئی جس میں کھڑے ستونوں کے بالائی حصے چھت کے اندھیرے میں غرق تھے۔ ہال کے خاتمے پر ایک اور دروازہ تھا جہاں روشنی دھندلی پڑ گئی تھی۔ اس دروازے کے باہر ایک کافی کشادہ سیڑھی تھی جو عمارت کی درمیانی منزل میں ختم ہوتی تھی۔ آفس اسی منزل پر واقع تھا۔ یہ ایک بڑ کمرا تھا جس کا پچی کاری کا فرش اور دیواریں بتا رہے تھے کہ یہ عمارت ان دنوں کی یادگار تھی جب شہر پر مفلوک الحال لوگوں کا اتنا شدید غلبہ نہ تھا۔ کیا یہ کوئی اپنی نوعیت کا خفیہ چھاپ خانہ ہے جہاں حکومتِ وقت کا تختہ پلٹنے کی سازش چل رہی ہے؟

آفس کا منیجر ایک بڑی میز کے پیچھے بیٹھا میری طرف تاک رہا تھا۔ میز کے ایک سرے پر ایک کافی اونچا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا جس کی روشنی سیدھی اس کی لانبی انگلیوں پر گر رہی تھی۔ اس کے چہرے کو ایک ستون کے سائے نے ایک تہائی غائب کر رکھا تھا۔ شاید فون پر میں نے اسی سے گفتگو کی تھی۔

"ہمارا وقت گذر چکا۔" اس نے اپنی بیضوی فریم والی عینک کو میز پر رکھتے ہوئے کہا جہاں اس کے دونوں شیشے چمک اٹھے جیسے اس کی آنکھیں اب بھی ان کے پیچھے موجود ہوں۔ "میں ساری زندگی لوکل ٹرین میں سفر کرتا رہا مگر کہیں پر کچھ بھی نہیں

بدلا۔ آج بھی لوگ اپنے گھروں کے اندر وہی نا آسودہ زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ ٹھیک بھی ہے۔ ایک شہر کو مرنے کے لیے دہائیاں تو لگ ہی جاتی ہیں۔ اور یہ چند دنوں قبل کی بات ہے کہ میں نے مالک سے کہا، اب اس چھاپے خانے کو ایک خطیر رقم کی ضرورت ہے، ورنہ یہ پرانی مشینیں ہمیں مفلسی کی دلدل میں لے جائینگی۔''

''میرا خیال ہے سیڑھی سے اوپر آتے وقت میں نے ان کی پرشور گڑگڑاہٹ سنی ہے۔''

''ہمارے کچھ کلائنٹ اب بھی وفاداری کا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ مگر کوئی بھی تجارت زیادہ دنوں تک چیریٹی پر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' اس نے اپنی شیو کھجاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ یہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس میں چہرے کا بالائی حصہ پیشانی تک غائب تھا۔ ''بغیر تنخواہ کے مہینوں تک گذارا کرنا کوئی ہم سے سیکھے۔ ابھی کچھ مہینہ قبل ایک شخص تنگ آ کر اپنا بریف کیس اٹھا کر چلتا بنا۔ میں نے برسوں اسے اپنا ٹفن کا ڈبہ کھول کر سوکھی روٹی چباتے دیکھا تھا۔ وہ ہمارا بہت ہی بھروسے کا آدمی تھا مگر اس نے ہمیں ایسی کوئی مہلت نہ دی کہ ہم اس کے لیے کچھ کر پاتے۔''

میں نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ دوسری میزوں پر لوگ اپنے کم قیمت کے مگر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے بھوکے مگر وفادار تھے۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ کمپنی کے دیوالیہ پن کی خبر لوگوں تک پہنچے۔ ممکن ہے یہ اشتہار بھی ایسی ہی کسی حکمت عملی کا نتیجہ ہو۔

کچھ برس قبل تک کمپنی کے پاس مینوئل ٹائپ مشین کی ایجنسی تھی۔ وہ لوگ اس معاملے میں ملک کے ایک تہائی حصے کے بے تاج بادشاہ تھے۔ کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد کمپنی کے پاس بغیر بکی ہوئی مشینوں کا ڈھیر لگ گیا۔ کچھ مہینوں تک الیکٹرانک

ٹائپ مشینیوں کی مانگ رہی۔ اب وہ بھی ختم ہو چکی ہے۔" اب ایک آدھ فرانکل مشین بک جاتی ہے۔ مگر اس کا واحد اور سب سے بڑا خریدار سرکار ہے جسے سامان بیچنا شیطان کو اپنی آتما بیچنے کے برابر ہے۔" منیجر نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

پھر بھی کمپنی نے نئے آدمی کے لیے اشتہار دے رکھا ہے؟

ایک بزنس جب تک قائم ہے آدمی کی ضرورت تو پڑتی ہی رہتی ہے۔

اور یہ لوگ جو بیکار اپنی اپنی میز پر بیٹھے ہوئے ہیں؟

کوئی بیکار نہیں ہے۔ ہر کوئی ایک خاص کام کے لیے مخصوص ہے۔ مگر یونین اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس مخصوص کام کے علاوہ اس سے کوئی دوسرا کام لیا جائے۔

"اور میرا کام کیا ہوگا؟" میں نے گویا نیند سے جاگتے ہوئے کہا۔

"یہ تو آپ کو ہمارا آخری آدمی ہی بتا پاتا۔" ایک پل کے لیے منیجر کا چہرا اندھیرے سے باہر آگیا۔ اس کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہوگی مگر اس کے تیکھے نقوش اس کی نفی کر رہے تھے۔ "کاش وہ اچانک کام چھوڑ کر چلا نہ گیا ہوتا۔ اور یہ وہ آدمی نہیں تھا جس کا ذکر ابھی تھوڑی دیر قبل میں نے کیا ہے۔ وہ تو دن کے وقت بھی نشے میں ڈوبا ہوا رہتا۔ تو اس صورت میں اگر آپ کو اس کی جگہ رکھ لیا گیا تو آپ کو اپنے کام کی نوعیت خود ہی طئے کرنی ہوگی۔ اور یہ اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ آپ صرف اس کی جگہ پر بیٹھیں، الماری کے اندر پڑی ہوئی فائلوں اور کاغذات کا جائزہ لیں، فون کی ڈائریکٹری کھنگالیں، اس کے نمبروں کو اپڈیٹ کریں، سب کچھ آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔ پھر بھی اگر آپ اپنا کام ڈھونڈ نہ سکے تو کام خود آپ کو ڈھونڈ نکالے گا۔ یہ دنیا ایسے ہی چلتی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

میں نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا حوالہ دیا۔ کیا اب اس کی کسی کو ضرورت ہے؟

شاید اسے بھی کام میں لگا لیا جائے یا شاید اس کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ ہو سکتا ہے

اس پیشہ ورانہ مہارت کے باہر میں زیادہ کارآمد انسان ثابت ہوں۔ اکثر محنت و مشقت سے حاصل کی ہوئی ڈگریاں انسان کے اندر کی فطری صلاحیتوں پر قدغن لگا دیتی ہیں۔

میں تنخواہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس نے میری آنکھوں کو پڑھ لیا۔

''آپ تنخواہ کے سلسلے میں مطمئن رہیں۔'' وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا جیسے اان میں اسے کوئی نئی لکیر دکھائی دے گئی ہو۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہوگا، یہاں مہینوں سے لوگوں کو تنخواہیں نہیں ملی ہیں۔ آپ کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔''

''اچھا انتظام ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''سچ کہیں تو مجھے ایسے ہی کام کی تلاش تھی۔''

''اور ہمیں آپ کے جیسے آدمی کی۔'' اس نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کھڑا ہوتے ہی وہ ایک دوسرے انسان میں بدل گیا تھا جو میرے لیے بالکل نیا تھا۔ ''اور جناب اب آپ اس عمارت میں گھومنے پھرنے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ دیکھینگے اس کا ہر کمرا اتنا تاریک نہیں جتنا یہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، آپ کو اپنے کام میں مزا آئگا، اتنا مزا آئگا کہ آپ راتوں کو اپنا گھر جانا بھول جائینگے۔''

گھر! کیا واقعی میرا کوئی گھر تھا؟ کیا میں اس قسم کا انسان تھا جس کا کوئی گھر ہوتا ہے؟

○ ○ ○

نئی جگہ میرا کام کیا تھا؟ تین دن ہونے کے باوجود ابھی تک میں یہ سمجھ نہ پایا تھا۔ اسٹیل کی الماریوں میں بند فائلوں کے اندر چالان، بل، اور واؤچروں کی بھرمار تھی، ہر ضخامت اور ہر رنگ کے رجسٹر پڑے تھے جن کی تاریخیں بہت پرانی تھیں، سرکاری

نوٹس اور قانونی دستاویزات کے ڈھیر لگے تھے۔ ان کاغذات میں تقریباً ہر طرح کی متروک مشینوں کا ذکر تھا مگر ایسا کوئی سراغ نہ تھا جو میرے کام کی نوعیت کے بارے میں مجھے بتائے۔ اور یہ دو منزلہ عمارت جس کی دیواریں کہیں کہیں تین تین فیٹ تک دبیز تھیں اور ہر منزل کی بلندی تیس فیٹ سے بھی اوپر کی ہوگی، انسان کے دہرے قد کے برابر دروازوں اور قد آدم دریچوں کے سبب کسی پرانے محل کی یاد دلاتی تھی جس پر برا وقت اتر چکا تھا۔ کئی بڑے کمرے متروک مشینوں سے اٹے پڑے تھے اور کچھ کمروں کے اندر ان کے کل پرزے زنگ کھا کر آپس میں اس طرح گتھ گئے تھے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ دیکھنا ممکن نہ تھا۔ راہداریوں میں کھلنے والے زیادہ تر دروازے بند تھے اور کمرے کی کھڑکیوں پر لگی لوہے کی جالیوں کے منحنی سوراخ جھول سے تقریباً بند ہو گئے تھے۔ اس عمارت کے اندر چلنا ایک تیرہ و تاریک دنیا میں سفر کرنے کے برابر تھا۔

یوں ہی بھٹکتے بھٹکتے ایک دن میری ملاقات اس کمپنی کے مالک سے ہوگئی جو ایک نوجوان شخص تھا اور ایک بند دیوار گیر گھڑی کے نیچے کھڑا اوپر روشندان کی طرف تاک رہا تھا جس کے دھندلے شیشے سے ایک فاختہ چپکی ہوئی تھی۔ دیوار گیر گھڑی کا پنڈولم نکال لیا گیا تھا اور اس کے کانٹے دائمی طور پر اپنی جگہ تھم گئے تھے۔

''اتنی بڑی عمارت، کیا ہم اسے کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کر سکتے؟'' میں نے رائے دی۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میرا داہنا ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''ایسا کہتے وقت آپ صرف ایک بات بھول رہے ہیں کہ اس عمارت کا کوئی دروازہ شاہراہ کی طرف نہیں کھلتا۔ ہمارے پاس داخلہ اور خروج کے لیے صرف وہ چکر دار سیڑھی ہی رہ گئی ہے۔ اس نے اس کمپنی کو تباہ کر دیا۔''

"ایسا کب ہوا؟ اتنی بڑی عمارت، ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ اس کا اپنا کوئی داخلہ نہ ہو۔"

"کبھی اس کا اپنا ایک داخلہ تھا۔ دیوار چین کی طرح اونچا تو نہیں مگر کافی بلند تھا۔ شاید اس زمانے میں لوگوں پر رعب جمانے کے لیے اس طرح کے بلند و بانگ دروازے بنانے کا رواج تھا۔ تو جیسا کہ ان داخلوں کے ساتھ ہوتا ہے، ایک دن وہ اپنی محراب اور ستونوں کے ساتھ گر پڑا۔ کئی لوگ مارے گئے۔ کچھی برسوں تک عدالت اور پولس کی لپیٹ میں آ گئی۔ جب تک سارے معاملے درست ہوتے، ہمارے پڑوسی ملک میں آزادی کی لڑائی شروع ہو گئی، دیکھتے دیکھتے ہمارے داخلے پر ریفوجیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ان کی غیر قانونی تعمیرات کو قانون نافذ کرنے والوں کی شہہ حاصل تھی، سارا معاملہ سیاسی تھا۔ اس طرح یہ داخلہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔"

"آپ لوگوں نے اس کی واپسی کے لیے دوبارا عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا؟"

"بہت سارے مقدمے اب بھی عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ لیکن اب اس عدالت اور پولس سے بھی ایک بڑی آفات پیدا ہو چکی ہے۔ میدان میں ایک نیا جانور آ چکا ہے جس کا کل تک کوئی وجود نہ تھا، وہ ہیں پیشہ ور سیاست دان، اور یہ وہ سکہ ہے جس کے دونوں رخ غلط ہیں۔ یہ سب کچھ میرے دادا جان کے زمانے میں شروع ہوا، ایک بہت ہی چھوٹے سے کمرے میں، ایک ٹائپ مشین سے جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک مشہور و مقبول اخبار میں ڈھل گئی۔ مگر پھر وقت بدل جاتا ہے، خیالات باسی ہو جاتے ہیں، نئی سوچ کے ساتھ نئے لوگ آ جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم ہم لوگ کہاں پیچھے چھوٹ گئے۔ آج ان کی تحریروں کو میں پڑھتا ہوں تو مجھے حیرانی ہوتی ہے۔ یہ خیالات کتنے کم درجے کے تھے مگر اپنے وقت میں انھیں کتنے تقدس کے ساتھ دیکھا گیا۔ ہاں اختلاف کے پہلو تو نکالے جا سکتے ہیں، مگر کسی بھی دور یا تحریک کی تمام کی تمام چیزیں بالکل سیاہ یا سفید تو نہیں ہوتیں، نہ ہی سو فیصد قبول یا رد کی جا سکتی ہیں؟ سب کچھ ختم ہو

جانے کے بعد بھی کیا ہمارے اندر ان کے جراثیم باقی نہیں رہتے؟ خیر اب ان سب چیزوں کا کیا رونا۔ لڑائی تو اب بھی جاری ہے۔ اور میں آخری وارث رہ گیا ہوں۔ کہیں آپ ہمارے نئے آدمی تو نہیں؟ پچھلا آدمی اتنا برا نہ تھا، بلکہ اس کی شراب نوشی کے باوجود میں اسے پسند کرتا تھا۔ مجھے اس کے لیے افسوس ہے۔ کچھ لوگ ایک لمبی زندگی جی کر بھی کچھ نہیں پاتے۔''

میں نے اسے بتایا کہ اسی آدمی نے مجھے اس جگہ کا پتہ بتایا تھا، کہ میں اپنا کوئی تقرری کا پروانہ دکھانے سے قاصر ہوں کیونکہ ایسا کوئی پروانہ ابھی تک مجھے دیا ہی نہیں گیا ہے۔

وہ دو بار ہنسا۔

''ابھی کچھ مہینہ قبل ہمارے پشتینی مکان کو ایک بینک نے قرق کر لیا ہے۔ ہم ایک کرائے کے مکان میں اٹھ آئے ہیں۔ ہمیں کرائے کے مکان میں رہنے کی عادت نہیں مگر ہم کوشش کر رہے ہیں کہ عادت پڑ جائے۔ شاید آپ کے ساتھ بھی ایسا کچھ ہوا ہو گا۔ میں نے آپ کا تجربہ اور آپ کی سند دیکھی ہے۔''

''کچھ خاص نہیں ہے ان میں۔ مگر شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے سر ہلا کر حامی بھری۔ ''شاید مجھے انتظار کی عادت ڈالنی چاہیے۔''

○ ○ ○

اچانک ایسا کچھ ہو گیا ہے کہ میں بہت خوش رہنے لگا ہوں۔ بلکہ میری زبان بھی مجھے واپس مل گئی ہے۔ اس عمارت کے سبب کیا میں اس شہر کو زیادہ سمجھنے کے لائق ہو گیا ہوں، یہ شہر جس نے خود اپنی تباہی کی کہانی رقم کی ہے؟ یہ تارکول یا کنکریٹ کی سڑکوں پر حرکات و سکنات میں مصروف لوگ؟ کیا اس شہر نے ایک اکٹوپس کی طرح

انھیں اپنے ان گنت بازوؤں میں جکڑ نہیں رکھا ہے؟ کیا یہ سڑکیں اس اکٹوپس کے بازو نہیں ہیں؟ یہ مکانات کیا ان کے اندر زندہ انسان بستے ہیں یا یہ وہ باڑے ہیں جن کے اندر ان دیکھی پرچھائیوں سے سہمے ہوئے لوگ مذبح میں بھیجے جانے والے جانوروں کی طرح اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ گلیاں جہاں نیلے شیطانوں کی حکمرانی ہے اور قحبہ خانے جنھیں چیونٹیوں اور بچھوؤں نے آباد کر رکھا ہے۔ میں کیوں انھیں ہی سوچتا رہتا ہوں۔ کیا میرے حصے کا سورج مر چکا ہے؟ زندگی اور موت۔ کتنا عجیب کھیل ہے یہ۔ انسان جو دھیرے دھیرے مرتے ہوئے اپنی موت کھو بیٹھتا ہے۔ انسان جو زندہ رہنے کے تگ و دو میں یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا سانس لینا ایک میکانکی عمل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور میں نے اس پرانی عمارت کے ان گنت کمروں میں بھٹکتے ہوئے جانے کتنی بار خود سے بغیر جواب حاصل کئے یہ دریافت کیا ہے، بھلے آدمی، تمھیں کس چیز کی تلاش ہے۔ اور یہ خوشی جو تم نے دریافت کی ہے کیا اس دنیا کو رد کرنے کا کوئی نیا طریقہ ہے؟

''ایک دن تمھیں اس عمارت سے باہر جانے کا دروازہ مل جائے گا۔'' میرے سن رسیدہ دوست نے کہا۔ وہ اپنی کھڑکی پر کہنی رکھے کھڑا تھا اور بیڑی پیتے ہوئے باہر خوابناک نہر کی طرف تاک رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح نہر کی طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ''مگر تمھیں اس دن سے ڈرنا چاہئے۔''

''اگر میں نے اس دروازے کی تلاش کر لی تو یہ سینکڑوں لوگوں کی زندگی میں خوشحالی لے آئگا۔'' باہر ڈھلان میں ٹھنڈی ہوا سوکھی جھاڑیوں کے اندر سرسرا رہی تھی۔

''مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میں تمھیں پھر سے کہونگا کہ تمھیں اس دن سے ڈرنا چاہئے۔'' اور وہ صوفہ پر رکھے پرانے اخبارات کے بیچ کچھ ڈھونڈنے لگا۔ ''پھر بھی، جانے کیوں میرا دل کہتا ہے، تمھیں اپنی تلاش جاری رکھنی چاہئے۔ ہم انسانوں نے اپنی

کاہلی کے سبب مکڑوں کو ہر جگہ اپنے جال تاننے کا موقع دے رکھا ہے۔"

مجھے علم تھا کسی نیک دلی کے جذبے کے تحت میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہ کام کو شروع ہی سے بگاڑ دیتا ہے۔ میں خود کو سمجھایا کرتا، ہمیں اپنے عمل میں صرف وہی چیزیں رکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے جن کے بغیر ہم جی نہیں سکتے، جو ہمارے لیے آکسیجن کا کام کرے، دوسرے معنوں میں جو ہماری زندگی کی فوری ضروریات کا خیال رکھے۔ میں جانتا ہوں، اس دروازے کی تلاش ہمیں بالائی دنیا میں لے جانے والی ہے جہاں زندگی کی ہما ہمی ہے اور آگے بڑھنے کے مواقع بھرے پڑے ہیں، اور یہ خود میری آزادی کے لیے کتنا ضروری ہے، میں جو اس سطح زمین پر زندگی گذارتے ہوئے بھی زیرزمین ایک دنیا کے اندر قید کر دیا گیا ہوں۔

شاید میں اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہو پاتا اگر ہمارے میس کے اندر وہ واقعہ پیش نہ آتا، ایک ایسا واقعہ جسے کسی مقامی اخبار نے شائع کیا نہ کسی پولس اسٹیشن کے ذریعے اس کی چھان بین ہوئی، ایک ایسا واقعہ جس نے ہمیں اندر ہی اندر بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس معاملے میں میں واحد شخص نہ تھا۔ اس آسمان کے نیچے اور بھی لوگ تھے جنھوں نے اس واقعے کی گونج اپنے اندر محسوس کی۔

ہمارے ہوٹل کے داخلے پر لکڑی کا ایک دروازہ ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی راہداری ہے جو مڑ کر لوہے کے ایک دوسرے دروازے پر ختم ہوتی ہے۔ یہ لکڑی کا دروازہ آدھی رات تک کھلا رہتا ہے تاکہ دیر سے لوٹنے والوں کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، مگر لوہے کا دروازہ مقفل کر دیا جاتا ہے جسے میس کا نوکر اسی وقت کھولتا ہے جب اس کی زنجیر بجائی جائے۔ ایک دن اس لکڑی اور لوہے کے دروازے کے بیچ کی راہداری میں ایک شادی شدہ عورت کی اجتماعی عصمت دری کا واقعہ پیش آتا ہے جو کسی طعام گاہ کی تلاش میں ہمارے دروازے پر لکھے ہوئے Hotel De Bengal کے

نام سے دھوکہ کھا کر اپنے شوہر کے ساتھ آنکلی تھی۔ دونوں شاید اس شہر کے لیے اجنبی تھے اور ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس وقت ہم لوگ اوپر کے کمروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ جاڑے کی رات سڑکوں کو وقت سے پہلے سنسان کر ڈالتی ہے۔ ایسی راتوں میں، جب کہ ساری دکانیں اور ہوٹل بند ہو چکے ہوں، علی الاعلان باہر نکل کر کسی رستوران کی تلاش ایک بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے کمروں میں بھوکے رہ لیں۔ ہم ان سبھی لڑکوں کو جانتے تھے جو ہمارے ہوٹل کے باہر فلائی اوور کے ریلنگ پر بیٹھ کر نشہ لیا کرتے اور اسکول اور کالج جاتی لڑکیوں پر فقرے کسا کرتے۔ پولس انھیں نظرانداز کرتی تھی کیونکہ جیسا کہ میرے ایک پولس دوست کا کہنا تھا، اپنے تجربوں سے پولس اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ قانون میں تھوڑی سی ڈھیل کسی بڑے مجرمانہ عمل کو روکنے میں معاون ہوتی ہے۔

دراصل یہ واقعہ ہمیں ہوٹل کے مالک نے دوسری صبح بتایا۔ وہ اور اس کے وفادار نوکر نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ پانچ لڑکے تھے، بعد میں دو اور آ گئے۔ مرد اور عورت کے لکڑی کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی انھوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ لوہے کے بجنے کی آواز سے نوکر آہنی دروازہ کھولنے پہنچا تو اس نے سہمی ہوئی عورت کو زمین پر بیٹھے ہوئے پایا۔ اس نے مالک کو اطلاع دی جو آفس میں بیٹھا مئے نوشی میں مشغول تھا۔ وہ جب دروازے کے پاس آیا تو پوری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ لڑکوں نے ایک خالی کمرے کی مانگ کی، مگر اس نے انکار کر دیا۔

"سر، آپ کو ہمیں جگانا چاہئے تھا۔" قانون کے دونوں طالب علموں نے، جو میس کے ہر طرح کے معاملات میں پیش پیش رہتے تھے، تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور آپ نے ہمیں بھنک تک نہ دی۔ آپ نے یہ کیوں ہونے دیا؟''

''ان لڑکوں نے نشہ کر رکھا تھا۔ مجھے پتہ تھا اگر میں نے تم لوگوں کو جگایا تو معاملہ خون خرابے تک پہنچ سکتا تھا۔ پولس میرا ہوٹل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتی۔''

شاید وہ اپنی جگہ صحیح تھا۔ اسے اپنا ہوٹل چلانا تھا۔ لڑکوں نے باری باری اس عورت کے ساتھ منھ کالا کیا جب کہ اسی دوران مرد دیوار کی طرف منھ کیئے کھڑا رہا جس کی گردن سے ایک چھرا لگا ہوا تھا۔ تقریباً دو بجے رات کو ان دونوں کو ٹرام کی پٹریوں پر چھوڑ دیا گیا۔

کون تھے وہ؟ اتنی رات گئے اس شہر میں وہ کیا کر رہے تھے؟ دوسری صبح کسی اخبار میں اس واقعے کا ذکر نہ تھا۔ اس کا ذکر ہوتا بھی کیسے، ایک بڑا شہر کسی بڑے بلاٹنگ پیپر سے کم نہیں ہوتا جس میں جانے کتنے گھناؤنے واقعات جذب ہوتے رہتے ہیں۔ تو میں نے خود سے دریافت کیا، کیا اس واقعے سے کہیں پر کچھ فرق پڑ گیا تھا؟ کیا کہیں پر کچھ بدلا تھا؟ ہم لوگوں نے اس دن سے ان آوارہ لڑکوں پر حقارت کی نظر ڈالنا شروع تو کر دیا تھا مگر کیا ہم لوگ ان سے کسی طور الگ تھے؟ ممکن تھا کہ اگر ہمیں ایسا کوئی موقع ملتا تو ہم منھ پھیر لیتے، ہو سکتا تھا ہم کچھ بھی نہ کرتے، اس لیے نہیں کہ ہم اندر سے روشن تھے، بلکہ اس لیے کہ ہمیں پکڑے جانے کا خوف تھا، اوروں سے زیادہ خود اپنے ذریعے پکڑے جانے کا خوف۔ اگر ہم اپنے آپ سے چھپ پاتے (اور یہ لڑکے چھپ پاتے ہیں) تو ہو سکتا ہے کہ ہم ان سے بھی زیادہ برے ثابت ہوتے، شاید ہمارا اپنا ڈر ان لوگوں کو قتل کرنے پر مجبور کر دیتا، ایک بزدل انسان کا کارنامہ جو آخر کار اسے پھانسی کے تختے تک لے جاتا ہے۔ تو میں نے فیصلہ کیا، بہت دیر ہو چکی ہے۔ اگر مجھے اپنے اندر کے دونوں دروازوں کے بیچ کی گھناؤنی دنیا سے نکلنا ہے تو مجھے اس عمارت کے دروازے کی تلاش کرنی ہوگی جو اسے باہر کی ایک آزاد دنیا سے جوڑ سکے۔ یہ کہیں

پر موجود ہے اور کسی وجہ سے اسے صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے. ہو سکتا ہے ان لوگوں کو میرے آنے کا انتظار ہو۔ یہ دروازہ، اگر میں نے اس کی تلاش نہ کی، تو شاید میں اپنے جینے کے مقصد سے سرے سے محروم ہو جاؤں۔

وہ چھٹی کا دن تھا اور مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، جیسے پہلی بار مجھے اپنے منھ کے اندر زبان کا احساس ہوا ہو مگر مجھے خاموش رہنے کا حکم دے دیا گیا ہو، جیسے کسی نے سانس روک کر مجھے جاننے کی کوشش کی ہو اور اسے مایوسی ہوئی ہو۔ شاید ایسے ہی کسی دن یہ کام ممکن تھا۔ میں نے خود سے کہا، تم کسی عام دن کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ اس طرح کے کاموں کے لیے ایک خاص دن کی ضرورت پڑتی ہے. جب تم خود کو وہ نہیں پاتے جو بنیادی طور پر تم ہوتے ہو۔ تو وقت آگیا ہے کہ تمھیں صحیح جگہ، صحیح وقت اور صحیح کام کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس شہر نے ایک واقعے کے ذریعے تمھیں ایک پیغام بھیجا ہے۔ اب تک تم نے جو زندگی گذاری تھی وہ ایک ایسے انسان کی زندگی تھی جس کے اندر باہر کچھ بھی صحیح نہ تھا۔ تم صرف دوسروں کے بل پر جیتے آئے تھے، دوسروں کی گونج بن کر زندہ تھے۔ اور کیونکہ تمھیں زندہ رہنا تھا، تمھارے اپنے سمجھوتے تھے، اپنے فیصلے تھے جن کے تم غلام ہو چکے ہو۔ مگر اچانک ہی یہ سب کچھ نہیں بدلنے والا، ایک بڑے، ٹس سے مس نہ ہونے والے بوجھ کی طرح تمھیں خود کو آگے ڈھکیلنا ہوگا، ایک ایسے انسان کی طرح جسے گھر کے فرنیچر اور دوسرے الم غلم سامانوں کے ساتھ سی دیا گیا ہو، جو اپنے دورانِ خون اور دماغ کے اربوں خلیوں کے باوجود کسی کام کے لائق نہ رہ گیا ہو۔ تو فٹ برج کے اوپر کھڑے کھڑے میں نے آسمان کے کنارے دیکھا جہاں سورج کے ٹوٹے ہوئے انڈے سے زردی باہر آرہی تھی۔ عجیب روشنی تھی یہ جس میں مجھے یہ شہر اپنی سپاٹ چھتوں، دھند میں ڈوبی ہوئی گنبدوں میناروں اور لوہے کے پلوں کے ساتھ دور تک بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ یہ شہر جس کے در و دیوار گھس گھس کر ننگے ہو چکے تھے،

جہاں ہر کسی کو کسی ایسی ہستی کی ضرورت تھی جس کے اندر وہ اپنی جڑیں پھیلا سکے، جس سے وہ اپنی نمی اور معدنیات حاصل کر سکے۔

میں فٹ برج پر دیر تک نہیں رکا تھا کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے شام ہوگئی تھی اور شہر روشنی سے جگمگا اٹھا تھا۔

فٹ برج سے اترتے ہوئے میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شہر کی روشنی کے سبب وہاں ستارے نظر نہیں آرہے تھے۔

سب وے کے اندر کثیف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ یک چشم بھکاری چکر دار سیڑھی کے نیچے سے غائب تھا۔ یہ اس کے یہاں ہونے کا وقت نہیں ہے۔ وہ شاید کہیں اور موجود ہے، شاید کسی کھولی میں، یا پائپ کے اندر یا کسی بھٹیار خانے میں اپنی روٹی کے ٹکڑے کر رہا ہے۔ چکر دار سیڑھی کے خاتمے پر لکڑی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ دروازہ اہم نہیں ہے۔ سرنگ نما زینے سے چھاپے خانے کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی ہے۔ تو ان دنوں آرڈر تیزی سے آ رہے ہیں، بہت زیادہ تعداد میں آرہے ہیں، اسی لیے چھٹی کے دن بھی کام چل رہا ہے۔ آفس کا بڑا کمرا اور اس کے زیادہ تر کمرے سنسان پڑے ہیں۔ ایک آدھ نیم جان بلب یہاں وہاں روشن ہیں مگر ایسا لگ رہا ہے جیسے کاتب تقدیر ان کے بارے میں فیصلہ کرنا بھول گیا ہو کہ انھیں بلب رہنے دے یا انسانی کھوپڑیوں میں بدل دے۔ آہ، وہ لوگ جو ان کمروں میں موجود نہیں، ان روشنیوں میں ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے سرے سے ان کا کوئی وجود تھا ہی نہیں۔ آنکھیں جو آنکھیں نہ تھیں اور انگلیاں جنھوں نے کام کرنے کی عادت سے مفر پا لیا تھا۔ میں انھیں دیکھ سکتا، اگر یہ بلب اتنے بے جان نہ ہوتے، دوسرے لفظوں میں اگر سب کچھ شروع سے غلط نہ ہو گیا ہوتا۔ میس کے دونوں دروازوں کے بیچ کے واقعے نے بہت پیچھے جا کر شروعات سے ہی سب کچھ

غلط کر دیا تھا۔

کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑتا ہوا میرے پیچھے سے آ کر میرے کندھے سے چپک گیا ہے۔کیا میں انسان کی جگہ ایک خاص مقناطیس میں بدل گیا ہوں جو ہر بے جان چیز کو اپنی طرف کھینچنے پر قادر ہو؟ میں کاغذ کو جسم سے الگ کرتا ہوں۔ یہ فل سکیپ ہے اور اس پر کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہے اور ہر کوری چیز کی طرح یہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اگلے ہی پل بھول جاؤ اسے، وہ کہتا ہے اور میں اسے نیچے پھینک دیتا ہوں۔شاید اسے پتہ ہے اس دنیا میں کہنے کے لائق کچھ بھی نہیں ہے۔ان مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے باوجود میں اس گندے پانی کو سن سکتا ہوں جو شہر کے زمین دوز نالوں میں بہہ رہا ہے، دیواروں سے لٹکتی زنجیروں سے ٹکرا رہا ہے۔نہیں، یہ میرا تصور ہے، میں تو نیم تاریک دیواروں کے سائے میں رینگنے والا کیڑا ہوں جو کبھی بھی اڑ کر اندھیرے میں غائب ہو سکتا ہے یا ایک کپڑے چٹ کر جانے والا تتلی نما پتنگا ہوں جو کسی گرد آلود دیوار پر چپکا ہوا ہے۔ ایک ایسے انسان کی طرح جس کی سانسیں نکال لی گئی ہوں، میں چل رہا ہوں، ایک ایسی صبح، ایک ایسی روشنی، ایک ایسے دہانے کی تلاش میں جو مجھے شک وشبہات کے گھیرے سے باہر لا سکے۔میری کپڑوں کے اندر پسینہ جیسا کچھ رس رہا ہے جب کہ یہ فروری کا مہینہ ہے۔مگر کیا میں نے اپنے کلنڈر کو ٹھیک سے دیکھا ہے؟ کیا موسم نے اس کلنڈر کو ٹھیک سے دیکھا ہے؟ چلو، چلتے رہو، ورنہ اندر سے تم ہمیشہ کے لیے تھم جاؤ گے، یہ کائنات تمھارے لیے ایک ایسی گلی کی طرح ہے جو دونوں طرف سے بند ہے۔اس میں کہیں پر ایک بھی دروازہ نہیں ہے۔مگر جب تم اس کے اندر آئے ہو تو باہر جانے کا راستہ بھی یقینا ہوگا۔تمھیں پتہ ہے تم ایک ایسی عمارت کے اندر چلے آئے ہو جہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔یہاں کیڑوں مکوڑوں کی بھرمار ہے جو انڈوں سے باہر آ کر اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ اندھیرے میں چمک رہے ہیں۔ انھوں نے

تمھارے جسم کے ننگے حصوں پر رینگنا شروع کر دیا ہے۔ وہ تمھاری جلد میں اپنی سنڈیاں چبھو رہے ہیں۔ کسی مکڑے کے جالے نے تمھارے داہنے کان کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور اب اس سے مکڑیاں رینگتے ہوئے تمھارے حلقوم کے اندر اتر رہی ہیں۔ ایک عجیب احساس جیسے کچھ ہے جو ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے، ایسا کچھ جو موجود نہیں ہے مگر ہے۔ اور ان دیواروں پر ایک عجیب تھرتھراہٹ ہے جیسے دبائیوں کی تیرگی ان کے اندر سے باہر آنے کے لیے بے چین ہو۔ اگر ہمیشہ سے ان کے ساتھ یہ ہوتا آیا ہے تو یہ دیواریں اتنے دنوں تک زندہ کیسے رہ سکتی ہیں۔ اگر میری آنکھیں ہوتیں تو میں ان کی پژمردہ آنکھیں دیکھ سکتا۔ کہیں پر کچھ جل رہا ہے۔ تیل کی مہک! کیا یہ کسی طرح کی وارننگ ہے؟ کیا اس عمارت کے ان گنت کمروں میں، جن کی تمام بیرونی کھڑکیاں لوہے کی جالیوں سے ڈھکی ہوئی ہیں، میں واحد موجود شئے ہوں، باقی سب کچھ غائب۔

اور پھر مجھے وہ دروازہ دکھائی دے گیا۔ وہ ستونوں کے پیچھے سے ایک سیاہ فام افریقی کی طرح ابھرا تھا، ایک ایسی ہستی جو جو بھاپ میں ڈوبے ہوئے جنگل سے ابھی ابھی باہر آئی ہو اور اپنی بھاری بھرکم ٹانگوں پر کھڑی میری طرف تاک رہی ہو۔ ہاں، میں دیکھ سکتا تھا، اس کی دونوں آنکھوں کو جو غلط اونچائیوں پر بنی تھیں۔ چینی مٹی کی صراحیاں اس کے دونوں طرف کے ستونوں سے لگی کھڑی تھیں۔ ان مرتبانوں پر جیرنئیم کے بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ ان پھولوں کا رنگ کیا تھا اس کا تعین کرنا ناممکن تھا۔ ان سے بیلیں مردہ سانپوں کی مانند باہر نکل کر فرش پر ستونوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی اندر کی طرف چلی گئی تھیں۔ عرصہ ہوا کہ ان پر سرِ دن نے اپنا کام کرنا بند کر دیا ہے۔ ان مرتبانوں کو نہ چھونا ورنہ یہ چکنا چور ہو جائینگے، میرے دل نے کہا۔ نہیں، تم انھیں چھو سکتے ہو، شاید تمھاری ہتھیلی کے لمس سے یہ بیلیں زندہ ہو جائیں، میرے دل نے دوبارا

کہا۔آج وہ میری اجازت کے بغیر سب کچھ کہنے پر مائل ہے۔ مجھے دروازے پر ایک چھوٹا سا شگاف نظر آتا ہے اور میں اپنے داہنے ہاتھ کی چاروں انگلیاں اس پر رکھ دیتا ہوں۔ یہ باہر کی روشنی ہے جو دروازے کی درزوں سے رس رہی ہے۔میری انگلیاں روشن ہوگئی ہیں جیسے میرے تاریک وجود کے اندر ایک روشن انسان موجود ہو۔اگر یہ دروازہ باہر سے بند ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں کواڑ کے ابھرے ہوئے حصوں کو تھام کر اپنی پوری طاقت کے ساتھ اندر کی طرف کھینچتا ہوں۔ دونوں پلّے سختی کے ساتھ اپنے فریم سے چپکے ہوئے ہیں۔ان پر کالکھ کی ایک موٹی تہہ جمی ہے اور اسے اندر سے بند رکھنے کے لیے جس بالٹ کا ہونا تھا وہ اپنی جگہ سے غائب ہے۔اس کی جگہ کسی نے لوہے کی ایک سلاخ ڈال دی ہے۔ میں اسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔سلاخ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ مجھے اس کی ضد پسند نہیں آتی۔ میری لگاتار کوشش ایک جنون میں بدل جاتی ہے۔ یہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟ میں کیا پانا چاہتا ہوں؟ میں کس سے بھاگ رہا ہوں؟ اور جب کہ میں اپنی ہمت ہار رہا تھا، اچانک سلاخ اپنی جگہ سے نکل کر میری ہتھیلی میں آجاتی ہے۔ یہ اتنا اچانک ہوگیا ہے کہ میں اس کا بوجھ سنبھال نہیں پاتا۔اس کے فرش پر گرنے کی آواز گنبد کے اوندھے پیالے سے ٹکرا کر کافی دور تک پھیل گئی ہے۔اور جب کہ میں اپنی کالکھ زدہ انگلیوں کو آپس میں مسل رہا ہوں میں دیکھتا ہوں، کچھ چمگادڑ اپنی تاریک پناہ گاہوں سے نکل کر واپس ان میں چھپ گئے ہیں۔ مجھے اپنی چپلوں کے نیچے چمگادڑوں کی بیٹ کی نرمی کا احساس ہوتا ہے۔اگر میں نے چلنے کی کوشش کی تو میں پھسل کر گر سکتا ہوں۔مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں۔میں دروازے کے ابھرے ہوئے حصوں کو تھام کر اپنی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔کواڑ اب بھی آپس میں گتھے ہوئے ہیں جیسے انھوں نے میرے خلاف سازش کرنے کی سوچ لی ہو۔شاید یہ دیو قد افریقی میرے بس کی بات نہیں۔اور جب کہ

میں اپنے اندر سے کمزور پڑنے لگا تھا، داہنے کواڑ کے پینل عجیب ڈھنگ سے کانپنے لگے۔ میں دروازے سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پینل اسی طرح اپنی کسی اندرونی کمزوری کے سبب کانپتے رہے۔ پھر اس کے بالائی حصے سے لکڑی کا ایک ٹکڑا الگ ہو کر عین میرے سامنے آ کر گرا اور گھن کھائے ہوئے تختے کے اندر کی گرد میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس لکڑی کے گرنے سے کواڑ کے بالائی حصے پر روشنی کا ایک بڑا خانہ بن چکا تھا۔ دروازہ اتنا بڑا ہے کہ میرے کندھے پر ایک دوسرا آدمی کھڑا ہو جائے تو اس کے اوپری حصے کو چھو سکتا ہے۔ میں ایک بار پھر اسے اندر سے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لکڑی کے کچھ اور ٹکڑے اوپر سے گرتے ہیں، میرے بالوں اور کپڑوں پر لکڑی کے برادوں کے ساتھ ساتھ کچھ کیڑے بھی رینگنے لگے ہیں۔ کچھ روشن مگر بے ترتیب لکیریں دروازے پر جگہ جگہ جاگ اٹھی ہیں۔ انھوں نے بیٹ میں غرق فرش پر آڑی ترچھی لکیریں بچھا دی ہیں۔ یہ اس روشنی کا نتیجہ ہے کہ میرے چاروں طرف ایک نئی دنیا وجود میں آ چکی ہے جس میں میں دکھائی دینے لگا ہوں۔ دروازہ اب پوری طرح میرے قابو میں ہے۔ اس کے چاروں کناروں میں روشنی کی لکیریں بن چکی ہیں۔ آخر کار داہنی طرف کا کواڑ فریم سے الگ ہو کر ایک کراہ کے ساتھ اندر کی طرف کھل جاتا ہے۔

کواڑ کو اس کے کنارے سے پکڑ کر میں ڈھکیلتے ہوئے اندر لے آیا ہوں اور ٹھنڈے پسینے میں غرق لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہوں۔ اب میرے سامنے ایک مستطیل خلا ہے، یہ اتنا بڑا ہے کہ میں دوسرے کواڑ کو کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مکڑی کے جالے کو کان سے صاف کرتے ہوئے میں عمارت سے باہر آ گیا ہوں اور اس نیم منہدم شدہ باب ہیکل کے نیچے اپنے گیلے پیروں کے ساتھ کھڑا تازہ ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہوں۔

یہ کنکریٹ کا بنا ایک اونچا چبوترا ہے جس سے ایک کشادہ زینہ نیچے کی طرف اتر تا چلا گیا ہے۔ یہاں آس پاس کوئی غیر قانونی تعمیر نہیں ہے۔ ایک روشن شاہراہ تک پہنچنے سے قبل زینہ اندھیرے میں غائب ہو گیا ہے۔ اپنے شہر میں اس روشن شاہراہ کا وجود مجھے حیران کر دیتا ہے۔ اتنی روشنی! یہ میرے شہر کی روشنی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ وسیع و عریض زینہ جو بتدریج نیچا ہوتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا ہے، اس پر پاؤں رکھتے ہی میرے پیروں کے گیلے پن کا احساس کیوں اتنا تیز ہو گیا ہے جیسے آپ برف پر چل رہے ہوں؟ زینے کے دونوں کناروں سے ان گنت پگڈنڈی نما زینے نکل نکل کر اکٹوپس کے بازوؤں کی طرح اندھیروں میں گم ہو رہے ہیں۔ ان پر چلتے لوگ کون ہیں، یہ جو اپنی شکلوں، اپنے جسموں میں اقلیدس کی لکیروں کے علاوہ اور کچھ نہیں رکھتے؟ یہ جو جگہ جگہ سلنڈر کی طرح کھلے ہوئے ہیں یا کون کی طرح ٹوٹے ہوئے ہیں، یا پائپ کی طرح ٹیڑھے میڑھے نظر آ رہے ہیں، ان کی آنکھیں جو خود بھی غلط اونچائیوں پر بنی ہیں، ایک دوسرے کی نفی کر رہی ہیں۔ کیا یہی زندگی کی سچائی ہے اور ان روشن لکیروں کے درمیان جو تاریکی ہے، جہاں ان دیکھے خداؤں کا وجود ہے، جہاں آنکھیں سبز ہیں اور ٹاٹ کے زرزر پردوں سے چہروں کے خطوط ابھر رہے ہیں، کیا سب کچھ ان ہی چیزوں سے بنی ہیں۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں، چھاپہ خانہ کی عمارت کافی بلندی پر، بلکہ شہر کی چوٹی پر کھڑی ہے، تاریک مگر موجود جیسے وقت اس کے وجود کو پوری طرح مٹانے میں ناکام رہا ہو۔ یہ باہر سے تاریک ہے مگر اس کا دہانہ، جو دروازے کے نصف کھلنے کے سبب نظر آ رہا ہے تابناک اور روشن ہو چکا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اس سے روشنی کا ایک دریا لاوا کی طرح بہتا ہوا شاہراہ کی طرف آ رہا ہو، شاہراہ خود جس پر انسانوں کا ایک ہجوم اپنی اقلیدس کی لکیریں اٹھائے چل رہا ہے۔ میں کہ اس شاہراہ سے دور ہوں مگر حیرت انگیز طور پر اس میں موجود ہوں، میں سوچ رہا ہوں اپنے جسموں کو

ڈھوتے ہوئے یہ لوگ۔ ان کے چہرے کتنے روشن ہیں جیسے وہ خاص قسم کے اندھیرے میں چمکنے والے کیڑے ہوں۔ یہاں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی، رد کیے جانے کے مکمل احساس کے باوجود جینے کے لیے جن چیزوں کا سہارا لیا جاتا ہے ان کا بوجھ ان کی ہڈیوں کو وقت سے قبل ٹیڑھی کرنے کے لیے کافی ہے۔ اپنی جگہ کھڑا مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میں ایک ایسی دنیا میں آگیا ہوں جہاں وقت خود کو دہرا رہا ہے، جہاں روشنیوں کے آس پاس تاریکیوں نے اپنا الگ نظام بنا رکھا ہے جن کے مطابق روشنیوں کو مرنا پڑتا ہے؟ آہ، یہ عجیب روشنی۔ جس کے بل پر ہم لوگوں نے ایک تہذیب کی بنیاد تو ڈال دی مگر اس تہذیب میں لوگ آج بھی اسی طرح تھکے ہوئے، کمہلائے ہوئے نظر آرہے ہیں جس طرح وہ روزِ ازل میں نظر آئے ہونگے جب خدا نے انھیں رد کیا ہوگا۔ روشن کھمبوں کے نیچے پتھروں پر بیٹھے ہوئے یا سر جھکا کر چلتے ہوئے یہ لوگ، زندگی کی ان دیکھی مانگوں سے نڈھال، اب جانے کس خدا کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے شاہراہ کی بھیڑ میں چلتے ہوئے مجھے اپنے چہرے پر ایک عجیب حرارت کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے کسی نے اس پر فاسفورس چھڑک دی ہو۔

''کیا واقعی، یہ کسی قسم کی نجات کا لمحہ ہے!'' میں اپنے چہرے پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے خود سے کہتا ہوں۔ نہیں، یہ میرا چہرا نہیں ہے جو جل رہا ہے، یہ کسی اور کا چہرا ہے جسے میں نے پہن رکھا ہے۔

''اور تم یہاں کیسے آگئے؟'' ایک لاغر عورت جانے کہاں سے نمودار ہو کر میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے اپنے بدن پر ایک چغہ ڈال رکھا ہے جس کا ہڈ اس کے سر پر پڑا ہوا ہے۔ ہڈ کے اندر کوئی چہرا نہیں ہے۔

''بس میں نکل آیا۔ اور آپ نے یہ چغہ کیوں پہن رکھا ہے؟ کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟''

"ہاں، تم مجھے جانتے ہو۔ اور مجھے یہ پہننا پڑا ہے کیونکہ میرے پستان سڑ گئے تھے۔ تمہیں تو پتہ ہے، میرے سارے بال گر چکے ہیں۔ مجھے یاد آیا تم نے میرے لیے ایک وگ لانے کا وعدہ کیا تھا۔" اندھیرے میں اس کے لانبے دانت چمک اٹھے ہیں "شاید تم نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم لوگ دوسروں کے دیے گئے دنوں میں جی رہے ہیں۔"

ہاں، میں اسے پہچان گیا ہوں۔ مگر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید اسے اس بات کا علم ہے۔ وہ مڑ کر چلنے لگتی ہے۔ میں اسے پکارتا رہ جاتا ہوں، مگر وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اقلیدس کی لکیروں میں ڈھل جاتی ہے۔

میرے خدا، میں اس روشنی کا کیا کروں جس نے سب کچھ اتنا ننگا کر دیا ہے کہ دیکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔ مجھے چھاپے خانے کی طرف واپس لوٹنا چاہیے۔ میں اتنی جلد ہار نہیں مان سکتا۔ میں نے اس دروازے کی دریافت کی ہے۔ ابھی میرا کام باقی ہے۔ دروازے کے دوسرے طرف کی دنیا وہ نہیں ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ واپسی پر میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے ہیں۔ میرے راستے کے دونوں جانب تاریک دریا سا کچھ ابل رہا ہے، جس میں کشتیاں ڈول رہی ہیں، ان میں جلتی لالٹینیں دراصل انسانی آنکھیں ہیں۔ تو کیا واقعی اس شہر کے سارے زمین دوز نالے سطحِ زمین پر آ گئے ہیں۔

چھاپے خانے کے دروازے پر سب کچھ پہلے کے جیسا ہے۔ اندر مشینوں کے شور میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس شدید کپکپاہٹ کے سبب کہیں نیم بوسیدہ دیواریں زمیں بوس نہ ہو جائیں، اس کے داخلے کی دیوار کے گرنے کا واقعہ ایک بڑے پیمانے پر پھر سے دہرایا نہ جائے۔ میں شور کا تعاقب کرتے ہوئے ایک بڑے ہال کے اندر نکل آیا ہوں جہاں مشینیں طوفانی رفتار سے چل رہی ہیں۔ یہ روایتی لیٹر پریس مشینیں ہیں جن پر لوگ جھکے ہوئے کام کر رہے ہیں، پلیٹیں اور روشنائی کے رولر بدل رہے ہیں،

فیڈ بورڈ میں کاغذات ڈال رہے ہیں۔ میں جانے کتنی دیر تک ان کے درمیان چلتا رہتا ہوں، مگر کوئی میری طرف نہیں دیکھتا۔ ان کی آنکھوں کے گڈھے تیرگی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کیا ان لوگوں کا کوئی چینج اوور ٹائم نہیں ہے؟ مشینوں سے کاغذ برابر نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ مگر چھپے ہوئے کاغذات کو چاک کرنے، تہہ کرنے، پنچ کرنے، لئی لگانے اور اسٹیپل کرنے کے لیے کوئی آن لائن آپریشن نہیں ہے۔ صرف دو کارندے ہیں جو ان کاغذات کے پلندوں کو اٹھا اٹھا کر ٹرالی کے اندر رکھ رہے ہیں، انھیں ڈھکیل کر ہال سے لگے کمروں کے اندر لے جا رہے ہیں۔ آخر کار تھک کر میں ایک ڈھیر سے کچھ کاغذات اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ ان میں کسی بھی کاغذ پر کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہے، صرف سیاہ روشنائی نے حاشیوں کو چھوڑ کر کاغذ کو دونوں طرف سے سیاہ کر رکھا ہے۔ تو یہ راز ہے اس چھاپے خانے کا! میں باری باری سے ان تمام کمروں کے اندر جاتا ہوں جن کا استعمال گدام کے طور پر ہو رہا ہے۔ ہر کمرے میں اسی طرح کے کاغذات کے ڈھیر اپنی ریکوں پر سجے ہوئے کہیں کہیں چھتوں کو چھو رہے ہیں۔ میں ایک ریک سے کچھ کاغذات کھینچ کر باہر نکالتا ہوں۔ ان پر گرد کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی ہے۔ پلندوں کو ایک دوسرے سے مار کر صاف کرتے ہوئے میں دیکھتا ہوں، یہ کاغذات تمام کے تمام سیاہ ہیں، شاید ان میں حروف آپس میں اتنے ملا دیے گئے ہیں کہ پورا صفحہ سیاہ ہو گیا ہے، یا ہو سکتا ہے کہ ان کاغذات میں کہیں پر ایک بھی لفظ چھپا ہوا نہ ہو، صرف ان پر سیاہی پھیر دی گئی ہو۔ مجھ پر اس حیرت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان تمام کمروں میں بس اسی طرح کے کاغذات بھرے پڑے ہیں۔ باہر آ کر میں چھاپے کی مشینوں کے سامنے حیران و پریشان کھڑا ہوں۔ ان پر کام کرتے لوگ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ ''آخر یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟'' میں چیخ اٹھتا ہوں۔ میری غیر انسانی چیخ کے سبب پہلی بار شاید انھیں میری موجودگی کا احساس ہوا ہے۔ انھوں نے

مڑ کر میری طرف دیکھا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہوتا،، واقعی ان کی آنکھوں کی جگہ تیرہ و تاریک خندقیں میری طرف گھور رہی ہیں۔ ''تم دونوں میرے پیچھے پیچھے آؤ۔'' میں مڑ کر ٹرالی مین سے کہتا ہوں۔'' میں اس چھاپے خانے کا نیا آدمی ہوں'' ۔ دونوں اپنی اپنی ٹرالی کے سامنے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ ان کی ہچکچاہٹ قائم ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بے حس وحرکت اپنی جگہ کھڑے اپنی آنکھوں کی خندقوں سے ایک دوسرے کی طرف تاکتے رہتے ہیں، پھر ان خندقوں میں ایک موہوم سی روشنی جاگتی ہے۔ شاید ان میں کسی قسم کا تبادلہ خیال ہوا ہے۔ وہ ٹرالیوں کو ڈھکیلتے ہوئے روازے کی طرف لانا شروع کر دیتے ہیں۔ انھوں نے دروازے کو دیکھ لیا ہے۔ وہ میری آواز پہچان چکے ہیں۔ برسوں سے انھیں اس آواز کا انتظار تھا۔

جانے کتنا وقت گذر گیا ہے۔ دونوں کارندے ٹرالیاں کاغذات سے بھر بھر کر میری ہدایت پر کھلے دروازے سے باہر زینے پر انڈیل رہے ہیں۔ دروازے کے سامنے کاغذ کا پہاڑ سا بن گیا ہے۔ یہ پہاڑ اس خلاء کے مقابلے جو دروازے کا ایک حصہ کھل جانے سے بن گیا ہے، بہت بڑا ہے۔ ٹرالیاں کمروں سے کاغذات سے بھری ہوئی باہر آتی جا رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کاغذ کا پہاڑ تیزی سے بلند ہوتا جا رہا ہے، ان میں سے پلندوں کی اچھی خاصی تعداد باہر زینے پر پھسلنے لگی ہے۔ دروازے کا ایک پلا اب بھی بند ہے۔ مگر وہ زیادہ دیر اپنی جگہ قائم نہیں رہتا۔ کاغذات کا بوجھ سنبھال نہ پانے کے سبب وہ ایک زوردار چڑچڑاہٹ کے ساتھ اپنے قبضوں سمیت باہر زینے پر جا گرتا ہے۔

جس کے ساتھ ہی چھاپے خانے کے اندر کی گڑگڑاہٹ اچانک رک گئی ہے۔

عمارت ایک عجیب سنّاٹے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ زینہ پر اوندھے گرے ہوئے پلّے پر کاغذات کے ڈھیر پھسلتے جا رہے ہیں مگر پھر بھی اس سے دھول باہر آ رہی ہے

جیسے اس کی روح نکل رہی ہو۔ دیمک نے اسے اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ مجھے اپنی پشت پر کچھ لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ تمام لوگ اپنی اپنی مشینوں کو چھوڑ کر میرے پیچھے جمع ہو گئے ہیں۔ میں اپنی سانس روکے سوچ رہا ہوں، کیا اس کائنات سے جو اس دروازے کے دونوں طرف موجود تھی ہم ہمیشہ کے لیے مفر پا چکے ہیں۔ کیا ایک نئی کائنات وجود میں آچکی ہے جس کے واقعی ہم مالک ہیں۔

عجیب سناٹا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے خاموشی ابھی ابھی بول پڑے گی۔

اور تب بہت ہی غیر محسوس طور پر روشندان کے نیچے سے ایک سریلی جھنکار ابھرتی ہے۔ یہ بہت ساری گھنٹیوں کی ایک ہم آہنگ آواز ہے۔ میں اسے پہچان لیتا ہوں۔ اس آواز کو میں بچپن سے اپنے اندر سنتا آیا ہوں۔ اور جب کہ دیوار گیر گھڑی اپنی جھنکار پےدرپے دہرا رہی ہے میری نظر اس کے پنڈولم پر جا ٹکتی ہے۔ وہ بہت ہی پراسرار طور پر اپنی جگہ واپس آچکا ہے اور اس کی پلیٹ دونوں اندرونی دیوار سے شدت کے ساتھ ٹکرا رہی ہے، جیسے زمین کی گردش اس کے محور پر کسی وجہ سے اچانک بہت تیز ہو گئی ہو۔ کیا یہ دنیا کے خاتمے کا اعلان ہے؟

ابھی میں اس پنڈولم کی گتھی کو سلجھا بھی نہیں پایا ہوں کہ اوپر روشندان میں کئی پر ایک ساتھ پھڑپھڑا اٹھتے ہیں۔ وہ ایک بڑا سا الو تھا جو کسی تاریک کونے سے نکل کر فاختہ پر جھپٹا تھا۔

مگر اسے دیر ہو گئی تھی۔

شکار گھنٹی کی آواز کے سبب پہلے ہی ہوشیار ہو چکی تھی۔

فاختہ روشندان سے تیر کی طرح نیچے آئی ہے۔ وہ ایک ستون سے ٹکرا کر گرتے گرتے خود کو سنبھال لیتی ہے اور ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔

کھلے دروازے کے سامنے ہم لوگ چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے ہیں، فاختہ

اپنے دونوں پر پھیلائے روشن آسمان میں اڑتی چلی جا رہی ہے۔ فاختہ نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے، جس کے ساتھ ہی روشن آسمان اچانک بجھ گیا ہے، شہر تیزی سے تاریکی میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے، زینے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اقلیدس کی لکیریں ماند پڑتی جا رہی ہیں۔ اب ان میں سے ایک بھی لکیر باقی نہیں بچی ہے۔ ایک تاریک کائنات مجھے چاروں طرف سے نگل چکی ہے۔ میں انگلیاں آنکھوں کے اندر ڈال کر دیکھتا ہوں۔۔۔

میری آنکھیں تاریک خندقوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

○ ○ ○

پیراسائٹ

اپنے بستر پر پڑا پڑا میں اس آواز کو سن رہا ہوں۔ پلستر کے اندر اینٹوں کے درمیان دھیرے دھیرے بالکل ہی بے آواز قدموں کے ساتھ وہ آگے بڑھ رہا ہے اور اب شاید اسے روکنا ممکن نہیں۔

جس دن پہلی بار میں نے ان باریک ریشوں کو اپنے کمرے کی دیوار کے پلستر پر اگتے دیکھا، میں نے اپنی بیوی سے کہا: "باہر دیوار پر ضرور کوئی پودا اُگ آیا ہے۔" میں نے ان باریک جڑوں کو چاقو کی مدد سے کھرچ کھرچ کر صاف کر تو دیا مگر کچھ مہینوں کے بعد وہ پھر اُگ آئیں۔ اس بار میری بیوی نے مجھ سے کوئی ٹھوس قدم اُٹھانے کے لیے کہا۔

"یہ اس مسئلے کا حل نہیں۔" مجھے دوبارہ چاقو سنبھالتے دیکھ کر اس نے رائے دی تھی۔ ہماری دونوں بیٹیاں جو دوسرے کمرے میں سوتی تھیں، جڑوں پر اپنی نفیس و ملائم انگلیاں دوڑایا کیں۔ کہیں پر وہ گرفت کے لائق تھیں تو وہ انھیں پکڑنے اور اُکھاڑنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔ جڑیں ٹوٹ تو رہی تھیں مگر انھیں پوری طرح اُکھاڑنا ممکن نہ تھا۔ کچھ نہ کچھ پلستر کے اندر رہ جاتا۔

"اس پودے کو گرانا ضروری ہے جو باہری دیوار پر اُگا ہوا ہے۔" ہماری بڑی بیٹی نے کہا جس کی تائید میں ہماری چھوٹی بیٹی نے اپنا سر ہلایا۔ وہ اپنی بڑی بہن کے سائے میں جینے کی عادی ہو چکی تھی۔

یہ ایک پرانی، کافی ٹوٹی پھوٹی کثیر منزلہ عمارت تھی اور فلیٹ چوتھی منزل پر ہونے کے سبب ہم لوگوں نے کبھی اپنے عقب کی دیوار پر دھیان نہیں دیا تھا۔ دونوں کمروں کی پیچھے کی طرف کھلنے والی چاروں آدم قد کھڑکیوں کو ہم زیادہ تر بند رکھتے یا پردوں سے ڈھانک کر رکھتے تھے کیونکہ نیچے گلی میں ہر بار کوئی نہ کوئی شخص کھڑا بے شرمی سے پیشاب کرتا نظر آتا۔

دراصل یہ کوئی گلی نہ تھی، یہ دورویہ قدیم عمارتوں کے عقب کی چھوڑی ہوئی زمین تھی جو گلی نما ہو گئی تھی اور زیادہ تر سنسان پڑی رہتی۔ میں نے طے کیا ایک دن اس گلی میں اُتر کر اس پودے کو دیکھوں گا جو اپنی جڑیں دیوار کے اندر پھیلا رہا ہے مگر پھر کچھ دوسرے معاملات نے میرے ذہن پر قبضہ جما لیا اور کچھ دنوں کے لیے میں ان جڑوں کو دماغ سے نکالنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک نفسیاتی سمجھوتے کے تحت سب نے اس کے تذکرے سے گریز بھی کیا اور ہم لوگوں نے دیکھا ہماری بے توجہی کے سبب جڑیں بھی بڑھنے سے رک گئی تھیں۔ صرف وہ دیوار پر اپنی جگہ قائم تھیں۔

''میں چھت پر گئی تھی۔'' ایک دن میری بیوی نے کہا: ''دربان خ۔ نے چھت سے نیچے جھانکنے کی بہت کوشش کی مگر تمھیں تو معلوم ہے اس چھت پر کوئی منڈیر کبھی نہیں تھی۔ تو میں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔''

''تم نے اچھا کیا۔ ویسے گھبراؤ مت۔ اس اتوار کو میں ایک مزدور بلا کر اس پودے کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکوں گا۔''

میں نے اپنی بیوی سے کہہ تو دیا، مگر مجھے پتا تھا یہ اتنا آسان نہ تھا۔ اس کام کے لیے پانچویں منزل تک بانس کا باڑ اگانا ہوگا، ایک مزدور سے یہ ممکن نہ ہوگا، کافی لاگت آئے گی۔ عمارت کے دوسرے مکینوں کی دخل اندازی الگ جو اس طرح کے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اتوار کو میں عقب کی گلی میں جانے کے لیے گھر سے نکلا تاکہ اس طفیلی پودے کی نشاندہی کرسکوں۔ گلی میں نالے کے کنارے کی جھاڑیوں سے

پیشاب کی سڑاندھ پھیل رہی تھی اور دونوں طرف کی عمارتوں کے ڈرین پائپوں سے، جن میں سے زیادہ تر ترخ رہے تھے گندا پانی نکل نکل کر دیوار سے رستے ہوئے نیچے جمع ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا ہماری اپنی عمارت کی دیواروں کے پلستر بیشتر جگہوں سے ادھڑ گئے تھے۔ اس دیوار پر کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں جن میں سے زیادہ تر تار کی جالیوں سے یا لوہے کے گرل سے ڈھک دی گئی تھیں۔ کہیں کہیں کسی کھڑکی کو اندر سے دیوار اُٹھا کر بند کر دیا گیا تھا۔ جو کھڑکیاں کھلی تھیں، ان سے سوکھنے کے لیے زیر جامہ پلاسٹک کے تاروں یا ہنگروں سے لٹک رہے تھے۔ مجھے پہلے پہل خود اپنی کھڑکی کو پہچاننے میں دقت ہوئی مگر میری بیوی اور بیٹیوں نے کھڑکیوں کی سلاخوں سے ہاتھ نکال نکال کر بلاتے ہوئے میری مدد کی۔ مجھے اپنی کھڑکیوں کے باہر کہیں پر کوئی پودا دیوار پر اُگا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ بہت سارے پودے اس عمارت کی دیوار پر مختلف جگہوں پر اُگے ہوئے تو تھے اور ان میں سے کچھ تو تناور درخت کی شکل بھی لے چکے تھے مگر وہ کافی دوری پر تھے اور وہ تعداد میں اتنے تھے کہ مجھے یہ واہیات نظر آیا کہ چند باریک جڑوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میں اتنی بڑی عمارت کی پوری عقبی دیوار کا صفائی کر ڈالوں۔

''اور کیا۔'' میرے آفس کے ساتھی نے کہا جس سے میں ہمیشہ اپنے دل کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ''اور اس میں جھمیلا کیا ہے، میں ایک اچھے راج مستری کو جانتا ہوں۔ وہ نہ صرف کافی تجربہ رکھتا ہے بلکہ میرے تو بالکل ہی بھروسے کا آدمی ہے۔''

''میں تمھارا احسان مند رہوں گا۔''

''ارے نہیں، دوستوں میں احسان مندی کا رشتہ نہیں ہوتا۔ اسے غیروں کے لیے رکھ چھوڑو۔''

راج مستری ایک ہفتے کے بعد وارد ہوا۔ اس نے پوری دیوار کو انگلیوں سے، پھر

اپنی کرنی سے ٹھونک ٹھونک کر دیکھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر لوہے کی سلاخوں نے رکاوٹ پیدا کی۔

"ان جڑوں کو پوری طرح ختم کرنے کے لیے ان کے چاروں طرف کم از کم دس فٹ تک پلستر اکھاڑ کر نیا پلستر چڑھانا ہوگا۔ نہیں میرا مطلب باہر کے پلستر سے نہیں، سارا کام اندر ہی اندر ہو جائے گا۔ میں نے ایسے بہت سے کام کیے ہیں۔"

میں نے چین کی سانس لی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر دریافت کیا:

"تمھیں یقین ہے کہ اس سے اس مسئلے کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو، میں ہوں نا۔" راج مستری مسکرا دیا۔ اس کے خشخشے بال سیمنٹ رنگ کے تھے اور آنکھوں میں سرخ ڈوریاں تیر رہی تھیں۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں، بس آپ کھڑے کھڑے تماشا دیکھیے۔" اس نے کھڑکی سے باہر تھوکتے ہوئے کہا۔

وہ پانچ دن تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ گھونگے کی رفتار سے اپنا کام کر رہا تھا اور زیادہ تر کھڑکی کے سامنے کھڑا کھینی گھستا رہتا یا باہر تھوکتا رہتا۔ سنگ تراش نے اس کی ہدایت پر جڑوں سمیت فرش سے چھت تک پلستر گرا دیے یہاں تک کہ آدھی دیوار پر پرانے زمانے کی اینٹیں سرخ مسوڑوں کی طرح نکل آئیں۔ ان اینٹوں کے درمیانی مسالے کے اندر جڑیں دبیز اور تاریک ہو رہی تھیں۔ کرنی سے کھرچ کھرچ کر راج مستری کے مزدوروں نے اور پھر اس نے خود انھیں صاف کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ کچھ جڑوں کے اندر سے دودھ کے قطرے بہہ نکلے۔ اب باہر سے ان جڑوں کے بقیہ حصے بہت مشکل سے نظر آرہے تھے۔ پانچویں دن شام سات بجے آخر کار دیوار کو پلستر سے ڈھکنے کا کام پورا ہو گیا۔

"اب آپ اسے بھول جائیے اور دیوار کے اس حصے پر رنگ چڑھوا لیں۔" اس

نے آخری دن کی اجرت قبول کرتے ہوئے کہا۔"اب جڑیں اسی صورت میں نکلیں گی جب کوئی چڑیا آپ کی کھڑکی کے باہر کسی نئے پودے کا بیج ڈال دے۔"

"اس کا امکان تو ہے۔"

"سو تو ہے۔" مستری نے کہا۔"مگر ہم ابھی سے کیوں سوچیں اور پھر سارے پرندے ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

○ ○ ○

ہمارے ملک کا چہرہ بدل رہا ہے۔ بہت سی باتیں ہو رہی ہیں، جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے اچانک کہیں سے کچھ لوگ نمودار ہوئے۔ انھوں نے مجھ سے ایک بڑی رقم کی مانگ کی۔

"یہ ایک بہت ہی بھیانک مسئلہ ہے۔" انھوں نے کہا۔"وہ ہمارے ملک کے اندر اپنی جڑیں پھیلا رہے ہیں۔ ان کی بیخ کنی کرنی ہے۔ بہت بڑا خرچ ہے۔ آپ کو تو فون آہی چکا ہوگا۔"

"ہاں! میرے آفس کے کالگ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے ان کی مانگی ہوئی رقم کچھ کم کر کے ادا کر دی۔" میں نے ان لوگوں سے کہا۔"میں پینتھر کا ممنون ہوں۔"

"پینتھر؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"اوہ سوری۔" میں نے کہا۔"مجھے لگا، میں یہ نام کہیں سن چکا ہوں۔"

"آپ اس طرح کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔" انھوں نے کہا۔"پینتھر کو ہم ان چھوٹی موٹی باتوں کیلئے پریشان نہیں کرتے۔ وہ تو بڑے بڑے فیصلے لینے کے عادی ہیں۔ آپ ان سے مل چکے ہیں؟"

''میں نے انھیں دور سے دیکھا ہے۔'' میں کہتا ہوں۔''اور ٹی وی میں تو برابر دیکھتا رہتا ہوں۔''

''آپ خوش نصیب ہیں کہ پینتھر کے عہد میں پیدا ہوئے اور بہت جلد ہم اور آپ پینتھر کی رہنمائی میں اس تاریک سرنگ سے باہر نکل آئیں گے۔ یہ خواب تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ اس الدورادو کا ذکر تو آپ نے سنا ہی ہوگا جس کی کوشش میں ہم سب مصروف ہیں۔''

''بالکل!'' میں کہتا ہوں۔''مگر کیا یہ اتنا آسان ہے؟ کیا اس کی ضرورت ہے؟''

''بالکل، اور سب سے بڑی بات، یہ اتنا مشکل بھی نہیں۔'' اس کے لیڈر نے کہا ہے۔''یوں بھی اگر آپ اپنے الدورادو کو پانا چاہتے ہیں تو اس میں یقین تو رکھنا ہی ہوگا۔ یقین کے بغیر عمل کس کام کا؟''

ان کے چلے جانے کے بعد بھی میں اپنے کھلے دروازے پر کھڑا رہا، جب میری بیوی کی آواز سنائی دی۔''وہ لوگ تو گئے۔''

''میں ان طفیلی پودوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' میں کہتا ہوں۔''کیا یہ اتنا آسان ہے؟''

''کیا۔''

''وہ جو اندر کے دشمنوں کی بات کر رہے تھے۔ انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔ کیا یہ اتنا آسان ہے؟''

''جانے کیا کہہ رہے ہو تم۔ انھوں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

میں اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ اور لوگوں کی طرح میں نے اپنے تعصبات کو اپنے گھر کے لوگوں میں عام نہیں کیا ہے مگر ہم ان کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کرتے۔ شاید جمہوریت کا تھوڑا بہت عنصر اس گھر کی چہار دیواری کے اندر

اب بھی بچا ہوا ہے، ہم جو اس ملک میں اپنے بچوں کو نفرت کے گھونٹ ان کے دودھ میں ملا کر پلانے کے عادی ہیں، ہمیں اپنے بچوں سے تھوڑی بہت زہر اُگلنے کی اُمید تو ہوتی ہے۔

''وہ اس پیسے کا کیا کریں گے۔'' میری بیٹی پوچھتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس طرح کے چبھتے سوالات کرنے کی عادی ہے۔

''اس پیراسائٹ کا خاتمہ کریں گے۔'' میں مسکرا کر کہتا ہوں۔ ''اور پیسے کے بغیر یہ دنیا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے بغیر تو تم ایک پودے کا بھی خاتمہ نہیں کر سکتی۔ جبکہ وہ جو کرنا چاہتے ہیں وہ ایک بہت بڑا کام ہے۔''

اب میری دنیا قدرے آسان ہوگئی ہے۔ اب میں سیدھے طریقے سے سوچ سکتا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے ایک اس سے بھی بڑا مسئلہ جس سے سارے لوگ دوچارہ ہیں۔

دوسرے دن آفس میں میرا کالگ (وہی جس نے طفیلی پودے کے سلسلے میں راج مستری بھیج کر میری مدد کی تھی) میرا کندھا تھپتھپا کر مجھے مبارکباد پیش کرتا ہے۔

''وہ لوگ تمھاری تعریف کر رہے تھے۔'' وہ کہتا ہے۔ ''وہ تم سے کافی متاثر نظر آئے۔''

''ان کا اپنا کوئی آفس تو ہوگا، کوئی ملنے کی جگہ۔''

''تمھیں دلچسپی ہے؟ ایک دن میں تمھیں ان کے کیمپ لے چلوں گا۔ لیکن فی الحال ان کے مقامی دفتر تو ہم جا ہی سکتے ہیں۔''

○ ○ ○

رات بالکل خاموش ہے، جیسے اس نے سانس روک لی ہو، جب میں اپنی بیوی کے ننگے سینے سے سر اُٹھا کر کہتا ہوں۔ ''تم کچھ سن رہی ہو؟''

"مجھے تو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔" وہ میرے سینے کے گھنگریالے بالوں سے کھیل رہی ہے۔ میں اس کا ہاتھ ہٹا دیتا ہوں۔ "وہ دیوار کے اندر چل رہا ہے، تم اسے سن سکتی ہو، صرف یقین کرنے کی ضرورت ہے۔"

"یہ تمھارا وہم ہے۔"

"نہیں، جیسا کہ میں نے کہا، صرف یقین کرنے کی ضرورت ہے۔"

میں دیوار کی طرف کروٹ لے کر سننے لگتا ہوں۔ ایک عجیب سے کھر کھر، جیسے دیوار کے ذرے دھیرے دھیرے ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دیوار پر ہاتھ رکھا۔ وہ آواز رک گئی مگر میرا ہاتھ ہٹاتے ہی پھر سے سنائی دینے لگی۔ میں اپنے خواب کے اندر بھی اس آواز کو سنتا رہا بلکہ خواب میں تو اس نے ایک شکل بھی اختیار کر لی تھی، ایک کیلوں مہاسوں بھرے چہرے والے بدصورت انسان کی شکل جس کے لانبے لانبے بال تھے اور جو گاڑھی روشنائی کی طرح دیوار کے پلستروں کے اندر پھیلتا جا رہا تھا۔ میں جاگ کر دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا اور وہ دیوار کے اندر کھر کھر کرتا رہا۔

"شٹ اَپ!" آخر کار میں پلٹ کر کہتا ہوں اور وہ چپ ہو جاتا ہے۔

○ ○ ○

یہ ایک بالکل ہی معمولی سا آفس تھا جو ایک سرکاری زمین پر جبریہ قبضہ کر کے بنایا گیا تھا۔ اس میں اپنے کالگ کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ مٹی کے بھاڑ میں چائے پیتے ہوئے ہم لوگ اس انسان کو دیکھ رہے تھے جو میز کے کنارے خاموش بیٹھا تھا۔

لوگ پینٹر کا ذکر کر رہے تھے جس کی ایک بڑی سی تصویر پشت کی دیوار سے لگی تھی۔

"مسئلہ یہ ہے کہ یہ جانور بہت ہی تیزی سے افزائش نسل میں مصروف ہے۔" سکریٹری کہہ رہا تھا۔"اور پینتھر کا خیال ہے، اگر ہم نے اس کی بارآوری کی صلاحیت کو ختم نہ کیا تو ہم خود کسی شمار میں نہ رہیں گے۔"

"اور پینتھر کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔" میرے کالگ نے کہا۔ وہ میٹھی نظروں سے میری طرف تاک رہا تھا۔

"یہ کتنا عجیب ہے۔" میں کہتا ہوں۔"سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں۔" مجھے اپنے گھر کی یاد آرہی تھی جس کی دیوار کے اندر وہ طفیلی پودا بڑھتا جارہا تھا۔"اس مسئلے کا ایک دائمی حل تو ہوگا۔"

کیا اس وقت وہ طفیلی پودا میرے ذہن میں تھا؟

"نہیں، نہیں!" خاموش انسان نے گویا ہوتے ہوئے کہا۔"اور میں اس سلسلے میں پینتھر سے ایک لمبی گفتگو کر چکا ہوں۔ پچھلی کئی صدیوں سے کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے، صرف یہ کہ ہماری ایک پرانی تہذیب ہے جو دنیا کی تمام تہذیبوں کو اپنے اندر سمونے کی طاقت رکھتی ہے۔ سو تو ہو جاتا ہے، ہم بدل بھی جاتے ہیں مگر کیا دوسرے بھی بدلتے ہیں اور کیا انہوں نے ہمارے گھر کی دیواروں کی بنیاد سے پتھر ہٹانے کے کام میں کسی قسم کی کوتاہی برتی ہے، اسے کھوکھلا کرنے میں کوئی کسر رکھ چھوڑی ہے۔"

یکا یک وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے۔ اس نے اپنی دونوں مٹھیاں اپنی پشت پر کس لی ہیں۔"بہت دیر ہو جاتی ہے، بہت دیر مگر پھر بھی ہم سمجھ داری سے کام نہیں لیتے، نہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہمارا حشر بھی موئنجو داڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں جیسا ہوگا۔"

"آہ!" میں باآواز بلند کہتا ہوں۔"یقیناً ایک اہم فیصلے کی ضرورت ہے ورنہ وہ دیوار کے اندر پھیلتے پھیلتے ہمیں ہر طرف سے گھیر ڈالے گا۔"

"آپ نے کچھ کہا؟" سکریٹری نے مسکرا کر اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا ہے۔

''آپ آیا جایا کیجیے، پھر آپ چیزوں کو زیادہ صاف دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔''

''ہاں، ہاں، مجھے اس کی ضرورت ہے۔'' میں گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہتا ہوں۔ میں نے باقاعدگی سے وہاں جانا شروع کر دیا ہے۔ اکثر میں وہاں کسی کو نہ پا کر میز پر سر ڈال کر اونگھنے لگتا ہوں اور خواب میں اس طفیلی پودے کو سنتا رہتا ہوں جو میرے گھر کی دیوار کے اندر کھر کھر کرتا پھیل رہا ہے۔

''مجھے نہیں لگتا تم جو سوچ رہے ہو، وہ صحیح ہے۔'' میری بیوی کہتی ہے۔

''کیا؟ تمھارا مطلب ہے یہ اتنا بڑا ملک اس قابل بھی نہیں کہ اپنی کمزوریوں سے اُبھر سکے۔''

''جانے کیا کہہ رہے ہو تم؟'' وہ اپنے کام میں لگ جاتی ہے۔ ان دنوں اکثر میں پیچھے کی گندی گلی میں کھڑا عمارت کی دیوار سے نکلے ہوئے طفیلی پودوں کی طرف تاکتا ہوں۔ ان میں ایک پر ایک کوے کا ایک جوڑا گھونسلا بنا رہا ہے۔ یہ عمارت انگریزوں کے زمانے کی ہے۔ اس کی رکھوالی کے لیے کسی طرح کا ایسوسی ایشن وجود میں نہیں آیا ہے، سارے معاملات رام بھروسے چل رہے ہیں۔ یہاں رام بھروسے کا نام دربان خ-- ہے، خ-- نے میرے مسئلے کو سنا ہے۔

''صاحب جی! اب اسے جانے بھی دیں۔'' وہ کہتا ہے۔ ''یہ پودا ایک وہم بن کر آپ کے دماغ میں بس گیا ہے۔ یوں بھی اگر وہ واقعی دیوار کے اندر زندہ ہے تو اس سے کیا۔ یہ کتنی پرانی عمارت ہے، موٹی موٹی دیواروں والی، اسے ڈھانا اتنا آسان ہے؟ آپ کی اپنی زندگی میں تو یہ دیوار کو ڈھانے سے رہا اور پھر دیکھ لینا، یہ ایک دن مٹی بن کر خود اس دیوار کا حصہ ہو جائے گا۔''

''مگر میری آنے والی نسلیں؟'' میں چیخ کر کہتا ہوں۔ ''عجیب انسان ہو تم، تم صرف اپنے بارے میں سوچتے ہو۔ تم ان نسلوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے،

جن کیلئے اتنا بڑا مسئلہ ہم چھوڑ جائیں گے۔''

''صاحب جی! مجھے معاف کیجیے۔'' خ۔ گھبرا کر کہتا ہے۔''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔''

اب میں اس ممنوعہ دفتر میں زیادہ جانے لگا ہوں۔اب میں اپنی بحث میں کافی جارحانہ ہوتا جا رہا ہوں۔وہ لوگ قدر کی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ایک دن میں ان سے کہتا ہوں، میں پینتھر سے ملنا چاہتا ہوں۔وہ مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔کوئی مجھے پینتھر سے ملوانے کی بات نہیں کرتا لیکن ایک دن وہ کم گو انسان مجھ سے اکیلے میں کہتا ہے۔

''آخر تم پینتھر سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''شاید وہ میرے لیے کچھ کر سکے۔'' میں کہتا ہوں۔''میں رات رات بھر سو نہیں پاتا۔شاید وہ میرے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالے۔''

''پینتھر ایک گرم مزاج شخص ہے۔'' وہ کہتا ہے۔''وہ مسئلوں کا حل نکالنے کی بجائے مسئلے کھڑی کرنے میں یقین رکھتا ہے۔یہ اس کا ایک انوکھا طریقہ ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''پینتھر سے ملنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تم پینتھر کو سمجھ سکو کہ وہ کیا ہے۔'' وہ مسکرا کر کہتا ہے۔''یہ پینتھر تمھارے اندر ہی ہے اور اگر وہ وہاں نہیں ہے تو تمھارا پینتھر سے ملنا بیکار ہے۔''

میں اس کی بات سمجھ نہیں پاتا۔پھر جانے کیوں اس گفتگو سے میں تھک جاتا ہوں اور دوبارہ اونگھنے لگتا ہوں۔شاید وہ رحم بھری نظروں سے میری طرف تاک رہا ہے۔

میں اپنے گھر واپس لوٹنا نہیں چاہتا، وہ دیوار کے اندر کھڑ کھڑ کرتا رہتا ہے، مجھے سونے نہیں دیتا۔اس رات بھی وہی ہوتا ہے۔میں چیخ کر اسے تھمنے کے لیے کہتا ہوں۔میری

بیوی سہم کر جاگ جاتی ہے۔

''تم کوئی برا خواب دیکھ رہے تھے؟''

''کیا بکواس ہے۔ اس گھر کو ہو کیا گیا ہے۔'' میں کہتا ہوں۔ ''کیا تم سب بہری ہوگئی ہو۔ اسے سن نہیں سکتی جبکہ وہ اینٹ سے اینٹ بجاتا جا رہا ہے، ہمارا گھر ہماری آنکھ کے سامنے ڈھاتا جا رہا ہے۔''

''یہ تمھارا وہم ہے۔''

''نہیں!'' میں کہتا ہوں اور ایک پل کے لیے میری نظریں اس کے گالوں پر ٹھہر جاتی ہیں جن کی جھریاں تیزی سے بڑھتی جا رہی ہیں۔ اچانک مجھے اس سے نفرت ہو جاتی ہے اور میں کمبل کو ناک تک کھینچ کر سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسے جیسے خاموشی گہری ہو رہی ہے، وہ کھر کھر کی آواز بڑھتی جا رہی ہے۔ میں دونوں کان تکیے میں دفن کر دیتا ہوں مگر تکیے کے اندر سے وہ آواز اور بھی صاف سنائی دے رہی ہے۔ میں اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتا ہوں اور اسی حالت میں لیٹے لیٹے رات کا ایک بڑا حصہ بیت جاتا ہے۔ جانے کب میں گہری نیند سو جاتا ہوں۔

صبح کھڑکیوں سے روشنیاں کمرے میں برس رہی ہیں جب مجھے اپنی بیوی بیٹیوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا ہوں۔ وہ تینوں اپنی تحیر زدہ آنکھیں نکالے میری طرف تاک رہی ہیں اور اپنی ایڑیوں پر پیچھے ہٹتی جا رہی ہیں۔

''یہ، یہ تمھارے چہرے کو کیا ہو گیا ہے؟'' میری بیوی اپنی انگلی سے میرے چہرے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ میں گھبرا کر بستر سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

''کیا ہو گیا ہے میرے چہرے کو؟'' میں ان کی طرف بڑھتے بڑھتے رک جاتا ہوں اور وہ سب جو کہ خوف کے عالم میں دیواروں کے اندر سمانے کی کوشش کر رہی ہیں، میں مڑ کر قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہوں۔

آئینے کے اندر ایک بدصورت کیلوں مہاسوں والا انسان کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔
اس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں اور اس کے چہرے سے ہزاروں کی
تعداد میں لانبی لانبی باریک جڑیں لٹک رہی ہیں۔

○ ○ ○

کھوکھلے پیڑوں کی چپ

سڑک پر اتنے راہگیر بھی نہ تھے کہ وہ مختصر سا وقفہ نکال نہ پاتا جو اس کے لیے ضروری تھا، مگر پہلی دیوار، جس کا رخ اس نے کیا، اسکے نیچے کی زمین اسے آس پاس کے مقابلے اتنی صاف نظر آئی کہ اسے ہمت نہیں ہوئی۔

سڑک کی کھال ادھڑی ہوئی تھی۔ ہلکے نیلے آسمان کے نیچے کاسٹ آئرن کے لائٹ پوسٹ بجلی کے تار اٹھائے دور تک چلے گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر رات کو اندھے ہو جاتے ہونگے۔

تم اس شہر اور اس کے مضافات کو اچھی طرح سے نہیں جانتے، اس کے دل نے کہا، گرچہ پچھلے پانچ مہینوں میں وہ کئی بار یہاں آچکا ہے۔ اس نے سڑک کے دو رویہ مکانوں کی طرف دیکھا جن کی بناوٹ اور بلندیوں میں کہیں پر کوئی نظم نہ تھا۔ کسی دروازے پر کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے ان گھروں کے بے ڈھنگے پن پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ زندگی بھر اپنے ملک کے ہر دوسرے شہر میں وہ انھیں ہی تو دیکھتا آ رہا تھا۔ سڑک کی دھول پہیوں کی چوٹ کھا کھا کر کھڑکیوں تک اٹھ رہی تھی جن میں سے زیادہ تر بند پڑی تھیں۔ ایک آدھ قریب المرگ پیڑ یہاں وہاں چپ چاپ کھڑے تھے۔

اسی سڑک یا اس کی کسی ذیلی سڑک پر وہ ہوٹل واقع تھا جس کا کوئی نام نہ تھا

(یا شاید وہ اسے بھول چکا تھا)۔ جہاں ایک سستے ہوٹل کی تلاش میں کسی کی رہنمائی کے بغیر وہ پہلی بار پیدل پہنچ گیا تھا اور اس دن سے جب بھی شہر آتا اس کے دقیانوسی اسٹیشن سے پیدل چلتے ہوئے ہر بار وہاں پہنچ جاتا۔ کبھی سڑک پر ناک کی سیدھ پر چلتے ہوئے، کبھی گلی کوچوں میں چکر لگاتے ہوئے اور کبھی مکانوں کے درمیان کی کھلی جگہوں کو پار کرتے ہوئے۔ شہر کے بازاروں میں رکشوں اور سائیکلوں کا ہجوم تھا۔ مگر ایک بار اس نے ایک یکے کی سواری بھی دیکھی تھی جو مسافروں سے لدی اپنے ضدی گھوڑے کے ساتھ جانے کہاں سے آنکلی تھی۔

''تم اس شہر کو ٹھیک سے سمجھ لو۔'' اس سے کہا گیا تھا۔ ''وہاں ہمارے کچھ پرانے بقایاجات پڑے ہیں۔ ان لوگوں کو ڈھونڈ نکالنا اور ان سے رقمیں وصول کرنا، اب یہ تمھارا کام ہے، جہاں تک ہو سکے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ایک آخری کوشش ہے جس کے بعد ان ساری رقموں کو کھاتے سے حذف کرنا ہوگی اور ہو سکتا ہے اسی تناسب سے اس کی ذمہ داری تم پر عائد کی جائے۔''

وہ جس فرم میں کام کرتا تھا وہ اس کی نئی زونل مینجر تھی جسے کمپنی کے ڈوبے ہوئے پیسوں کی حصولیابی کے لیے بطور خاص بھیجا گیا تھا۔ اس نے کچھ لوگوں کو بنگلہ دیش بھیجا تھا، کچھ کو آسام روانہ کیا تھا اور اس کی ہدایت پر کئی لوگ شیلانگ اور میزورم کے پہاڑوں کی طرف چلے گئے تھے۔ اسے اس شہر میں بھیجنے کی زونل مینجر کی اپنی کوئی خاص وجہ رہی ہو تو ہو ورنہ اسے یاد نہیں جو اس سے پہلے وہ کبھی یہ شہر آیا ہو۔ پچھلے پانچ ماہ کے اندر اندر اس نے کچھ لوگوں کو ڈھونڈ تو نکالا تھا، مگر ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو تیزی سے چہرا بدل لیتے تھے۔ ان میں کچھ اپنے کاروبار میں مار کھا چکے تھے، کچھ نے دوسرا کاروبار کر لیا تھا اور اسے الٹا مقدمہ کی دھمکی دینے لگے تھے اور ایک آدمی ایسا بھی تھا جس نے اس دنیا سے پوری طرح کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور ایک پرانے، ٹوٹے

چھوٹے حویلی نما مکان میں زندگی گذار رہا تھا جو دو منزلہ تھا اور کھو کھلے پیڑوں کے ایک جنگل کے قریب بلکہ عین اس کے اندر واقع تھا۔ پچھلی بار وہ اس شخص کی تلاش میں وہاں پہنچا تو وہ اپنے بے تکے سفر پر نکلا ہوا تھا۔ ہر سال وہ ایک آدھ بار اسی طرح جہاں گردی کرنے نکل جاتا۔ وہ کب لوٹتا اس کی خبر کسی کو نہ ہوتی۔ اس مکان کے باہر برگد کا ایک لحیم شحیم پیڑ تھا، جس کی جڑیں شاخوں ٹہنیوں سے اتر کر مٹی کے اندر پیوست ہونے لگی تھیں۔ اس کے سائے میں ایک پیر سالہ شخص اپنی بید کی نڈھال کرسی پر بیٹھا اونگھا کرتا۔ ایک کچی عمر کا لڑکا اس کے کندھے اور سر کی مالش کیا کرتا۔ وہ اس مکان کا مالک یا ایک قسم کا نگراں تھا جہاں وہ مقروض شخص کرایہ پر ایک کمرے میں رہتا تھا۔ اس پوری عمارت میں وہی واحد کرایہ دار تھا ورنہ اس کے زیادہ تر کمرے بند پڑے تھے۔ اوپر کی منزل کے کمرے تو اتنے عرصے سے بند تھے کہ اب وہ رہائش کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ ان میں سے کئی پرندوں کا دائمی بسیرا بن چکے تھے۔ وہ لڑکا کسی کی ناجائز اولاد تھا جسے بوڑھا ریل کی پٹری سے اٹھا کر لایا تھا۔

آخر کار اس نے ایک گوشہ ڈھونڈ ہی نکالا۔ یہ ایک ویران کھڑکی تھی جس کی بیرونی دیوار سے اگے ہوئے طفیلی پودے اب تقریباً ٹھنٹھ میں بدل چکے تھے۔ لگتا تھا یہ کھڑکی مکان کے ایک ایسے حصے میں واقع تھی جس کی ضرورت اب اس کے مکینوں کو نہ رہ گئی ہو۔ نالے کے کنارے کھڑے ہو کر جس کا غلیظ پانی سوکھے پتوں سے ڈھکا ہوا تھا اس نے اپنا ہاتھ نیچے کیا ہی تھا کہ کھڑکی سے ایک تیز چیخ سنائی دی اور کچھ لوگ عمارت کے اندر حرکت کرتے نظر آئے۔ مگر یہ اس کا تصور بھی ہو سکتا تھا۔ ریکسن کی تھیلی کو کندھے سے لٹکائے وہ اپنی متوحش آنکھوں سے اس کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا جیسے وہ ابھی کی ابھی کھل جائے گی اور اس کے اندر سے کوئی آدم خور نکل آئے گا۔ دم سادھے اس نے تھوڑی دیر انتظار بھی کیا۔ نہ کھڑکی کھلی نہ اس مکان سے کوئی شخص باہر آیا، مگر اب وہ اپنا ارادہ ترک

کر چکا تھا۔

میرے خدا، کیوں میں ہر بار ایک ایسے پیادے کی طرح پٹ جاتا ہوں جس کی پہلی چال ہی غلط ہوگئی ہو۔ اس ہچکچاہٹ کے سبب میں نے تو اپنی ساری زندگی ملیا میٹ کر ڈالی۔

سڑک پر اب ایک آدھ جگہ دکانیں نظر آنے لگی تھیں جب اسے ایک عوامی پیشاب خانہ دکھائی آیا جس کی مہک سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پیشاب خانے کی دیوار سے لگی مشروبات کی ایک غیر قانونی دکان تھی جہاں نائلن کے دھاگوں سے سڑے گلے پھل لٹک رہے تھے۔

○ ○ ○

وہ کوڑا کرکٹ سے ڈھکی ایک گہری ندی تھی جس کے دونوں کنارے ایک ہی شہر آباد تھا جس کا نام اب وہ کسی کو بتانے سے گریز کرتا تھا۔ وہاں کبھی اس نے اخبار میں ایک ایسے آدمی کی کہانی پڑھی تھی جس نے اپنی پچاس سالہ زندگی کی آخری دو دہائیوں میں ایک بار بھی اپنے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا، یہاں تک کہ جب دنگائیوں نے جو دریا کے دوسری طرف سے کشتیوں میں بھر بھر کر آئے تھے، محلے پر حملے کا منصوبہ بنایا تو وہ واحد شخص تھا جو اپنا گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ بعد میں اس کی آدھی جلی ہوئی لاش اس کے آنگن میں پڑی پائی گئی۔ اس نے جب وہ خبر پڑھی تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی بلکہ اس نے خواب میں اسے دیکھ کر اس کا چہرا ظنے کرلیا جو خود اس کا اپنا تھا۔ ہمیں اس سے فرق نہیں پڑتا کہ اپنے کام کے سلسلے میں ہم ساری دنیا گھومتے رہتے ہیں۔ دراصل ایک آزاد انسان کی زندگی جیتے ہوئے بھی ہم اپنی زندگی کے بنے بنائے ڈھانچے کے اندر قید ہوتے ہیں بلکہ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب ہم

اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ اپنے ملبوں کو ہٹا کر ایک نئی زندگی کی شروعات کر سکیں۔
اور کل ملا کر بالکل بیکار ہے یہ سب کچھ، ہوٹل کے کمرے میں بستر پر بیٹھا وہ سوچ رہا تھا۔ کمرے کی واحد کھڑکی سے پڑوس کے گھروں کے بالائی حصے اور آسمان کا ایک بے داغ ٹکڑا نظر آ رہا تھا جو برص کی طرح سرخی مائل تھا۔ ابھی ابھی تو دن شروع ہوا ہے۔ ابھی شہر کے لوگوں نے رات کی کسلمندی بھی ٹھیک سے اتاری نہ ہوگی۔ اس نے ٹٹول کر تکئے پر ہاتھ رکھا جو لکڑی کی طرح سخت تھا۔ اس کا غلاف اس کے سامنے بدل دیا گیا تھا مگر نیند سے جاگ کر اس نے دیکھا وہ پچھلے غلاف کی طرح ہی گندا نظر آ رہا تھا۔ بستر کے سرہانے دیوار کے پلستر پر ایک انسانی سر کا سیاہی مائل دھبہ جم گیا تھا جیسے وہ بیک وقت ان تمام لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہو جو اس سے قبل اس کمرے میں ٹھہر چکے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ ہچکچاہٹ کے ساتھ اس دھبے کی طرف تاکتا رہا پھر اس سے گریز کرتے ہوئے سر کی پشت کو دیوار سے ٹکا کر چھت کی طرف تاکنے لگا جہاں سیلنگ فین کا ہک لٹک رہا تھا۔ وہ دیر تک اسی طرح چپ چاپ بیٹھا اس ہک کی طرف تاکتا رہا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب لاشعوری طور پر اس کا سر دیوار کے دھبے پر جا ٹکا تھا۔ سیلنگ فین کی غیر موجودگی میں (اسے گرمی کے آتے ہی اس ہوٹل کے ذریعہ کرایہ پر لے لیا جاتا ہوگا) چھت بالکل ننگی اور بدنما لگ رہی تھی۔ لوہے کا یہ ہک جس کے اوپر چھت کے سوراخ سے بجلی کے دو مڑے تڑے تار جھانک رہے تھے. جیسے انتظار کر رہا ہو کہ اور کچھ نہ صحیح، ہو سکتا ہے وہ ایک دن کسی زندگی سے ہارے ہوئے انسان کے کام آ جائے۔
اس نے بستر کے سرہانے لگے پش بٹن کو دبایا جس پر گھنٹی کی تصویر ماند پڑ چکی تھی۔ کہیں پر گھنٹی کی آواز سنائی نہ دی۔ بہت دیر تک کوئی آیا بھی نہیں۔ بستر سے اتر کر وہ دروازے تک گیا اور اس کا ایک پٹ کھول کر اس نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ بالکنی جو راہداری کا کام بھی کرتی تھی، دونوں طرف آخری سرے تک سنسان پڑی تھی۔ لوہے کے

ریلنگ پر ایک دو جگہ کپڑے سوکھ رہے تھے۔ راہداری جہاں مڑ گئی تھی، چوبی زینے کے پاس ایک سفید بلی بیٹھی اپنی مونچھیں صاف کر رہی تھی۔ دروازہ کھلتے دیکھ کر وہ چونکی مگر پھر اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ دروازہ بند کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے سیڑھی کے چرمرانے کی آواز سنائی دی۔ ایک شخص نمودار ہوا مگر وہ ہوٹل کا ملازم نہ تھا۔ اس نے سر اندر کر لیا اور دروازے کی سٹکنی چڑھا کر بستر پر پہلے کی حالت میں سر دیوار سے لگا کر بیٹھ گیا۔

اس نے سوچا، واقعات اس لیے رونما ہوتے ہیں کیونکہ ہم انسان انھیں سوچتے ہیں۔ مثال کے طور پر مجھے کسی کی تلاش ہے اور اب دیر سویر اسے میرے سامنے موجود ہونا ہی ہے۔ اور یہ کسی دوسرے کی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم اس کائنات میں ایک خاص وقت اور مقام کے اندر داخل ہوتے ہیں جہاں کھلے آسمان کے نیچے سارے واقعات ہمارے منتظر ہوتے ہیں۔ مگر یہ واقعات خلاء میں رونما نہیں ہوتے، نہ ہی غائب ہونے کے لیے یہ کسی خلاء کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ واقعات بھی کسی دوسرے کی سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں، جنھیں انسان اپنی سوچ کے ذریعے اچک لیتا ہے، اپنا حصہ بنا لیتا ہے، خود کو اس کے مطابق ڈھال لیتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت اور مقام آجاتا ہے جہاں سارے واقعات اپنے اختتام کو پہنچتے ہیں اور ایک انسان کھڑا یا بیٹھا پلکیں جھپکتا رہ جاتا ہے، سوچتا رہ جاتا ہے، واقعات کا جنم داتا، واقعات جس کے ساتھ زندگی بھر قدم ملا کر چلتے رہنے کے باوجود اپنی خودمختاری برقرار رکھتے ہیں، اور آخر کار وہ دن بھی آجاتا ہے جب وہ ایک ٹھنڈی قبر میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہ سارے واقعات جو زندگی بھر اس کے ساتھ پیش آئے تھے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس بے کراں کائنات کے اندر کھو جاتے ہیں جیسے ان کا کبھی کوئی وجود نہ رہا ہو۔

اس وقت جب میں نے اس کوڑا کرکٹ کے کولاژ سے ڈھکے دریا کے کنارے

ایک عارضی رہائش اختیار کر رکھی تھی، میری عمر کیا رہی ہوگی؟ اسے اس وقت بھی جب وہ ایک سنگین بستر پر بیٹھا تھا، اپنی عمر کا صحیح اندازہ لگانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ جو تیز پہیوں والا شہر تھا جہاں یونیفارم میں ملبوس فوجی شہر کی سڑکوں پر گھوما کرتے، دکانوں کے باہر کھڑی نوخیز لڑکیوں کو اپنی سبز ملیٹری گاڑیوں کے اندر سے اشارے کرتے شہوت انگیز گرسنگی سے دیکھا کرتے اور اپنی پہلی فرصت میں کسی قحبہ خانے کی راہ لیتے۔ یہ قحبہ خانے دریا سے نکلے ہوئے ایک قدرتی نالے کے کنارے ناریل کے درختوں کے سائے میں کھپریل کے غیر قانونی چھپروں کی شکل میں کھڑے تھے جن سے تھوڑی دوری پر لوہے کے ایک کمانی پل کے اوپر بیسوائیں گاہکوں کا انتظار کرتیں۔ یہ شہر اور چیزوں کے مقابلے ان قحبہ خانوں کے لیے زیادہ مشہور تھا جن کے لیے لوگ دور دور سے اس شہر میں آیا کرتے۔ وہاں میں نے ایک راز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں دفن کر دیا تھا۔ یہ میری زندگی کے وہ گناہ بھرے دن تھے جب میں نے ازدواج کا طوق اپنے گلے میں ڈالا نہیں تھا۔ کس قدر سرپھرا تھا میں ان دنوں اور کیسے تلملائے بغیر بڑے بڑے واقعات و حادثات سے گذر جاتا؟

دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ ہوٹل کا نوکر تھا۔ تو واقعی وہ گھنٹی کام کر رہی تھی۔ اسے یہ کمرا بدلنا ہے۔ اس کی دیواروں سے مہک آتی ہے۔ نوکر نے انکار میں سر ہلایا۔ آج کے لیے ہوٹل میں داخلے کا وقت جا چکا۔ اب صرف ایک اور دن کے قیام کے لیے یہ ممکن نہیں۔ اگر وہ کل بھی رک جائے تو شاید کوئی کمرا خالی مل جائے۔ وہ ہوٹل کے منیجر سے ملنا چاہے گا۔ وہ اس ہوٹل کا منیجر بھی ہے اور نوکر بھی۔ وہ اور ایک دوسرا آدمی مل کر ہوٹل کا سارا انتظام سنبھالتا ہے۔ اس نے چینی مٹی کی پیالی کی طرف دیکھا جس کے پیندے میں چھوڑی گئی چائے سوکھ چکی تھی۔ یہ پیالی اس کے آنے سے پہلے سے وہاں موجود تھی۔ نوکر یا منیجر نے اس کی آنکھوں کا تعاقب کرتے ہوئے پیالی کو دیکھ لیا اور

اسے اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اسے اس کے پیچھے پہلی بار دیوار پر کھٹملوں کے مسلے جانے کے نشانات نظر آئے۔ اس نے سوچا، یقیناً اس ہوٹل کے دوسرے کمروں کا بھی یہی حال ہوگا۔ اسے اپنے پچھلے قیام کی کوئی تفصیل ٹھیک سے یاد نہ تھی۔ ممکن ہے وہ اس وقت ان لوگوں کے بارے میں زیادہ سوچتا رہا ہو جن کے لیے اسے بھیجا گیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ذہن پر زور دیے بغیر وہ اپنے پہلے سفر کی ہر تفصیل کو یاد کر سکتا تھا سوائے اس ہوٹل کے جسے پہچاننے کا واحد وسیلہ اس کے پڑوس میں کھڑی وہ پرانی عمارت تھی جس کے کلاک ٹاور کی ایک دھندلی تصویر اس کے ذہن میں محفوظ ہو گئی تھی۔ اور اب جب کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ میں اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب ہوتا ہوں یا نہیں (یوں دیکھا جائے تو اسے چند کامیابیاں ملی تو تھیں) تو ایک طرح سے پوری اخلاقی ذمہ داری میرے کاندھوں پر آجاتی ہے۔ نئی مینیجر ایک موٹی ویشن مشین ہے، سیلس مین کی ایک میٹنگ کے دوران جب ایک شخص نے اپنے ایریا میں نوے فیصد فروخت کے ٹارگیٹ کی کامیابی کا راگ الاپا تھا تو اس نے کس طرح حال میں کھیلے گئے ایک کرکٹ میچ کا حوالہ دے کر اسے لاجواب کر دیا تھا۔ "آپ نے ٹی وی اور اخبارات میں دیکھا تو ہوگا، کوئی بھی ان چورانوے رنوں کا تذکرہ نہیں کر رہا تھا جو اس سلامی بلے باز نے بنایا تھا بلکہ ہر کوئی ان چھ رنوں کی بات کر رہے تھے جو وہ بنا نہیں پایا تھا۔"

یہ الفاظ ہو بہو تو اس کے نہ تھے مگر کم و بیش وہی تھے۔ اپنی زندگی میں اس نے کئی پرائیویٹ فرموں میں نوکری کی تھی اور ہمیشہ مردوں کے مقابلے عورتوں کو زیادہ ذہین اور ضدی پایا تھا۔ شاید یہ وہی بات تھی کہ آپ کسی چیز کو ایک جگہ دباتے ہیں تو وہ کسی دوسری جگہ سے ابھر آتی ہے۔ نئی مینیجر ایک آتش فشاں تھی جو ہر چیز کو اپنے لاوے میں ڈھک لینا چاہتی تھی۔

ایک چڑیا کھڑکی کی سل پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کے پر بہت ہی اجلے اور پھیلے ہوئے

تھے اور اس کے سر پر جسم کے مقابلے بال زیادہ تھے۔اس نے دیکھا پرندے کی چونچ کا سرخ رنگ اس کی نوک کی طرف سے درکنے لگا تھا اور اس کے زرد پنجوں اور سفید ناخنوں سے ایک عجیب نقاہت ٹپک رہی تھی۔شاید وہ کافی بوڑھی ہوگئی تھی۔ہم کبھی پرندوں کی صحیح عمر کا اندازہ لگا نہیں پاتے۔میں انھیں بچپن سے دیکھتا آرہا ہوں مگر چند پرندوں کے علاوہ زیادہ تر کے نام نہیں جانتا، بلکہ ان میں سے زیادہ تر کو غلط ناموں سے جانتا ہوں۔اسے اپنے منھ کے اندر ایک بدمزگی کا احساس ہونے لگا جسے بہت دیر سے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ٹیبل سے المونیم کا جگ اٹھا کر اس کا ڈھکن کھولنے کی کوشش میں اس نے بہت سارا پانی ٹیبل اور فرش پر گرا دیا۔وزن سے اسے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ جگ لبالب بھرا ہوا تھا۔اس نے گلاس سے ایک گھونٹ لینے کے بارے میں سوچا، پھر اپنا ارادہ ترک کر کے غسل خانے کے اندر چلا گیا۔یہاں کوئی بیسن نہ تھا، صرف پیتل کا ایک دقیانوسی نل ٹپک رہا تھا جس کے نیچے پلاسٹک کی ایک بالٹی الٹی رکھی تھی۔مگ نل کے پائپ سے لٹک رہا تھا۔اس نے نل کھول کر کلی کرنے کی کوشش کی۔نل کی ٹونٹی سے پانی کی ایک پتلی دھار بے دلی سے گر رہی تھی۔ہوٹل کے پانی میں پانی کا کوئی مزا نہ تھا۔شاید اس شہر میں پانی ایک بڑا مسئلہ ہے۔کمرے میں واپس آکر اس نے اپنی ریکسن کی تھیلی سے تولیہ نکالا جو دھلتے دھلتے پاپڑ کی طرح سخت ہوگیا تھا۔

اس دنیا میں رنگوں کو چڑھتے دیر نہیں لگتی کہ وہ اترنا شروع کر دیتے ہیں۔واہیات، اس نے تھیلی کو بستر پر ڈھکیل دیا۔اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔مجھے جلد غسل کر لینا چاہیے۔اس نے اپنی ذاتی ڈائریکٹری کھول کر، جس کے اوراق کثرت استعمال کے سبب ٹانکوں سے نکلے پڑ رہے تھے، ان ٹھکانوں پر نظر ڈالی جہاں اسے جانا تھا۔وہ ہر طرح کی روشنائی سے لکھے ہوئے اور بار بار بدلے گئے لفظوں کے ارد گرد کچھ ڈھونڈ رہا تھا جیسے شہر کے مضافات میں بھٹک رہا ہو۔

○○○

شہر سے تین کوس دور ایک راستہ نکلتا تھا جس کے زیادہ تر پتھر نوکیلے دانتوں کی مانند زمین سے باہر نکل آئے تھے۔ کبھی کسی زمانے میں اس پر تارکول چڑھایا گیا ہوگا، مگر اب اس کے کچھ ہی ٹکڑے بچے تھے جو زخم کی پپڑیوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ سڑک کی ناگفتہ بہ حالت کے سبب شاید ہی گاڑیاں اس طرف آتی ہوں۔

میرا ایک نام ہے جو کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں اور میری پشت پر وہ شہر ہے جہاں سے میں ایک آٹو رکشا کے کیپسول میں نمودار ہوا ہوں۔ اس نے سکہ تھماتے وقت ڈرائیور کا چہرا نہیں دیکھا تھا۔ وہ سر داہنی طرف جھکائے راستہ بھر تھوکتا آیا تھا اور ضروری ہوگیا تھا کہ اس کے بارے میں نہ سوچا جائے۔ مگر اب، جب کہ راستہ ایک ڈھلان میں گم ہو رہا ہے، میں اس آسمان کی طرف کیوں تاک رہا ہوں؟ اس میں اب کیا رہ گیا ہے؟ واقعی یہ حیرت انگیز ہے، ہم لوگ ساری زندگی اسے تاکتے تاکتے تھک جاتے ہیں مگر یہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور اس کے نیچے زندگیاں اپنے معمول پر چلتی رہتی ہیں۔ ہاں ہم چھوٹی چھوٹی بغاوتیں تو کرتے ہیں، مثال کے طور پر کچھ لوگوں نے شہر کو رد کیا ہے اور اس سے باہر رہنا منظور کیا ہے، یا کبھی کبھی ہم سر تکیہ کے نیچے ڈال کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں، یا ایک نئی سوچ کا بیڑا اٹھاتے ہیں، یا پھر تھک کر سوچتے ہیں، یہاں سے میں نے سب کچھ ایک مردہ ماضی کے حوالے کر دیا ہے، اور اب میں ایک نیا انسان ہوں، بالکل نیا جیسے ابھی ابھی میں اپنی ماں کی کوکھ سے باہر آیا ہوں، خون اور مخاط میں ڈوبا ہوا اور میں نے اسے دردِزہ سے نجات دلائی ہے اور میرا باپ سگریٹ پیتا ہوا میری طرف تاک رہا ہے جیسے اس واقعے سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ بعد میں یہی شخص کتنا ذمہ دار ثابت ہوا تھا بلکہ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر مارا

بھی گیا تھا۔

برگد کے پیڑ کے نیچے بوڑھے کی کرسی خالی پڑی تھی۔ایک مختصر سا کوا اس کے گدے پر پنجے جمائے اس کے ایک سوراخ میں جس سے ناریل کے چھلکے جھانک رہے تھے، اپنی چونچ آزمارہا تھا۔مکان کے اندر اس کا آدمی کھڑکی کی سلاخوں کو انگلیوں سے تھامے کسی قیدی کی طرح کھڑا تھا۔

''شاہراہوں سے کتنی شاخیں پھوٹتی ہیں، انسان کے بھٹک جانے کا کتنا احتمال ہوتا ہے، ایک آدھ چور زمین اور زیادہ تر تاریک دلدلیں، چند ٹوٹے ہوئے سائن پوسٹ یا کسی حجام کی دکان کے باہر بیٹھے ہوئے لوگ مگر آدمی ہے کہ اپنی منزل تک پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔''

ہمیشہ کی طرح چند حیرت انگیز لفظوں کے ساتھ اس نے اس کا استقبال کیا ہے۔ مقروض کے چہرے میں ایک غیر معمولی چمک ہے۔شاید اس بار کے سفر نے اسے چند خاص تجربوں سے دوچار کیا ہے۔وہ ایک آنکھ قدرے چھوٹی کرکے تاکنے کا عادی ہے اور یہ اس کی نئی عادت ہے۔وہ مڑ کر ڈھلائی لوہے کے پھاٹک کی طرف تاکتا ہے جس کے دونوں حصے زمین پر جھاڑ جھنکار اگ آنے کے سبب اب نصف ہی کھل پاتے ہیں۔اس کے دونوں ستونوں میں سے کسی ایک پر ایک گدھ کا ہونا لازمی ہے جو وہاں نہیں ہے۔

مکان ہمیشہ اسی طرح سنسان نہ تھا، جیسا کہ پچھلی ملاقات پر اس شخص نے بتایا تھا، کبھی اس میں بھی خوشیوں کی چہکاریں گونجتی تھیں۔اس کے اندر اپنے میک اپ اور ماہواری کی مہک کے ساتھ بہت ساری عورتیں رہتی تھیں جنھیں جاننے کے لیے آدمی کا اس عہد میں جانا ضروری نہیں ہوتا(آپ آج بھی اپنی آنکھیں بند کئے بغیر انھیں دیکھ سکتے ہیں)۔کمرے میں رکھی لکڑی کی واحد کرسی مہمان کے حوالے کرکے وہ کھڑکی کی

طرف پشت کر کے کھڑا تھا۔ اس نے اسے پوچھے بغیر بتایا کہ اب اس گھر میں ایک کم گو بوڑھا باقی رہ گیا ہے جو اس مکان کا آخری نگراں ہے۔" اس کے پاس مردہ یادوں کا خزانہ ہے جس پر وہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ یہ عجیب ہے نا، کچھ لوگ اپنے حصے کی زندگی جی چکے ہوتے ہیں، مگر زندگی ہے کہ اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔"

یہ ہم انسان کی بہت ساری بدنصیبیوں میں سے ایک ہے، مگر اسے اس سے کیا لینا۔ وہ ڈائری نکال کر اس کی بقایہ رقم اور اس کی سود کی شرح پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ اسے اس بات پر قدرے غصہ بھی آیا تھا کہ یہ عجیب وغریب شخص کس دلچسپی سے اس کی ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا وہ کوئی تماشہ ہو جو بطورِ خاص اس کی تفریح کے لیے کھیلا جا رہا ہو۔ آج بھی وہ اسی طرح کھڑکی کی طرف پشت کئے کھڑا ہے۔ پھر وہ دو قدم آگے بڑھ کر اپنی داہنی کہنی کو الٹے ہاتھ سے تھام لیتا ہے۔" ساہوکار اور مقروض کا رشتہ بھی کسی چوہے بلی کے کھیل کی طرح ہوتا ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو آپ اور ہم دونوں ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔"

وہ اپنی ڈائری بند کر لیتا ہے۔ وہ اسے بتانا چاہتا ہے کہ دونوں ایک ہی کشتی پر ہرگز سوار نہیں ہیں، کہ وہ کوئی ساہوکار نہیں ہے، اس کی حیثیت ایک ادنی ملازم سے زیادہ کی نہیں ہے۔ یوں بھی اس کا ایک بھرا پرا کنبہ ہے جس کے افراد اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں جب کہ مقروض شخص ایک مفرور انسان کی زندگی جی رہا ہے جسے اپنے لوگوں سے کوئی مطلب نہیں۔ مگر وہ ایسا کچھ بھی نہیں کہتا۔ وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ کچھ الفاظ، وہ سوچتا ہے، وہ ہمارے بغیر بھی جی لیتے ہیں۔

"معاف کیجئے۔ شاید میں غلط تھا، شاید ہم دونوں ایک کشتی پر سوار نہیں ہیں، وہ میری بھول تھی۔" مقروض کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر تاریک پڑ گئی تھی۔ پھر اس نے چند بہت ہی حیرت انگیز باتوں کا انکشاف کیا۔ اس نے بتانے کی کوشش

کی کہ کیسے یہ عجیب وغریب دنیا ہمارے بادبانوں میں کسی نہ کسی طرح کی ہوا بھرتی رہتی ہے اور ہم اس کی زد میں آ کر یا یوں کہیں کہ اپنے کمزور انسانی کندھوں پر اس کا بوجھ اٹھائے اپنے کسی کنارے کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ کنارا۔ بہت سارے لوگوں کو تو اس کے وجود سے سرے سے انکار ہے اور اگر ایسا ہے تو ہم اپنے لنگر ڈالیں تو کہاں ڈالیں۔

''آپ کو ایسی کسی زمین کا پتہ ہے جس پر حضرتِ انسان نوح کی طرح اپنی کشتی سے باہر آ کر اپنا پیر رکھ سکے۔'' اس نے ایجنسی کے نمائندے کی آنکھوں کے اندر تاکتے ہوئے کہا۔'' اور یہ ایک ٹھوس زمین ہو نہ کہ اس کی سوچ کا بنایا ہوا ایک مابعد الطبیعاتی قلعہ۔''

وہ اسے بتاتا ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ کہ اسے اور بھی کچھ لوگوں کو ڈھونڈ نکالنا ہے۔ اور وہ ان سب باتوں کا کوئی مطلب کیسے نکال سکتا ہے جن سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو؟

''اور میں اسی جگہ ہوں جہاں پر آپ مجھے پچھلی بار چھوڑ کر گئے تھے۔'' وہ مسکراتا ہے۔ اس نے اپنی کہنی چھوڑ دی ہے اور اب اس کے دونوں ہاتھ جسم کے دونوں طرف لٹک رہے ہیں جیسے وہ کوئی کٹھ پتلی ہو۔ وہ عجیب نظروں سے مہمان کی طرف تاک رہا ہے۔ کیا اس آدمی کو اس بات کا علم نہیں کہ اس شہر کو کن حالات میں اس نے چھوڑا ہے۔ اسی درمیان اس نے کئی سفر بھی کئے۔ دنیا کی گردش کو جاننے کی کوشش میں اس کی پیاس کچھ اور بڑھ گئی، مگر اسے پانی کی ایک بوند نصیب نہ ہوئی جیسے وہ مریخ میں زندہ ہوں۔ واقعی یہ حیرت انگیز ہے نا اس زمین پر رہتے رہتے اچانک اس زمین کا ختم جانا اور ایک آدمی کا خود کو لق و دق صحرا میں پانا، جیسے وہ کسی دوسرے سیارے پر پہنچ گیا ہو جہاں نہ ایکسیجن ہے نا پانی۔ اور یہ آدمی کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے، ایک صحرا میں وقت کی ضرورت ہی کسے ہے، یہ تو ہم خوامخواہ وقت کی کمی کا رونا روتے

رہتے ہیں ورنہ وقت توانسان کے پاس اتنا ہے کہ وہ اس سے صحیح سلامت گذر ہی نہیں سکتا۔ دیر سویر اسے ٹوٹنا ہی پڑتا ہے، کسی تابوت یا پھندے کی پناہ لینی ہی پڑتی ہے۔

مہمان کو اس اکتا دینے والی خاموشی سے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسے وہ میلوں کی مسافت طئے کر کے آیا ہوا کوئی مسافر ہو۔ شاید ہمارا ایک سفر وہ بھی ہے جو ہم اپنے اندر طئے کرتے رہتے ہیں لیکن کیا اس کی تکان جسمانی ہوتی ہے؟ کیا مقروض کو اس بات کا علم ہے کہ کمپنی اب عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بارے میں سوچ رہی ہے اور اس کے لیے اس نے ایک ایسے وکیل کا انتخاب کیا ہے جس کی شہرت سے یقیناً اسے واقفیت ہوگی، کیا اس نے اسے یہ بات بتائی ہے؟ ہاں، دین دار اثبات میں سر ہلاتا ہے، اسے کون نہیں جانتا۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ یہی وقت ہے، وہ اسے مشورہ دیتا ہے، یہی وقت ہے، اور شاید اس کے لیے اس سے زیادہ اچھا اور کیا ہو سکتا ہے خاص طور پر جب کمپنی سود کے ساتھ ساتھ پچاس فیصد کی رقم معاف کر دینے کے لیے تیار ہے۔

''تو اب مجھے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔'' مقروض ایک آہ بھر کر کھڑکی سے باہر تاکتا ہے۔ ''مجھے اس کا افسوس رہے گا، میرے پاس اپنا کچھ نہیں ہے سوائے اس زندگی کے جسے میں جینے پر مجبور ہوں۔ کاش غلامی کا دور پھر سے واپس آسکتا۔ کم از کم سر چھپانے کے لیے مجھے آقاؤں کے اصطبل تو مل جاتے۔ میں اس آزادی کا کیا کروں جو ایک بددعا کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے۔''

کیا معاملہ اس قدر سنگین ہے؟ اس نے ڈائری بند کر لی۔ کیا ایسا کوئی آدمی نہیں جو اس کی مدد کے لیے سامنے آئے؟ کیا اتنی لمبی زندگی اس نے بیکار ہی گزاری؟ یقیناً کبھی اس کا بھی ایک بھرا پرا کنبہ رہا ہوگا جس میں جیسا کہ اس نے اس ویران مکان کے بارے میں کہا تھا، اپنے میک اپ اور ماہواری کے ساتھ بہت ساری عورتیں

موجود رہی ہوں گی، مگر پھر وہ اچانک اکیلا کیونکر ہوگیا؟ وہ اپنے گھر سے سیدھا یہاں تو آیا نہیں ہوگا۔ اس نے بہت سارے ٹھکانے بدلے ہونگے۔ ایک مفرور انسان سے آپ ہر طرح کی امید کر سکتے ہیں۔

''مجھے حیرت ہے۔'' اس نے مقروض کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''آپ اتنے بڑے گھر میں واحد کرایہ دار ہیں۔''

''میں ایک دن بھٹکتا ہوا اس ویران جگہ پر آنکلا اور پھر لوٹ کر نہیں گیا۔ بوڑھے نے مجھے اپنا شکار بنالیا۔''

شکار؟

''تو آپ کیا سمجھتے ہیں۔'' وہ مسکرا رہا ہے۔ ''بظاہر اس کی سوکھی چمڑی کے سبب جو موسم سرما کی پہلی ٹھنڈی لہر کے ساتھ تڑخ جاتی ہے، آپ بوڑھے پر ترس کھانے پر مجبور ہونگے، مگر وہ ایک مکڑی ہے جس نے اپنا نہ نظر آنے والا جال پھیلا رکھا ہے اور میں اس میں آپھنسا ہوں۔''

''میں نے انھیں جب بھی دیکھا ہے آنکھیں بند کئے ہوئے پایا ہے۔''

''اور بند آنکھوں کے ساتھ آدمی کو سمجھنا مشکل ہے۔ بلکہ وہ انتہائی خطرناک ہو جاتا ہے۔''

''اور کھلی آنکھوں کے ساتھ؟''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ اپنی کہنی کھجا رہا تھا۔ ''انسان کی آنکھیں تو دوسروں کو فریب دینے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ آنکھوں کے ساتھ انسانوں کا سامنا تو آپ کر ہی نہیں سکتے۔ جس طرح بھری دوپہر میں آپ سورج پر آنکھیں ٹکا نہیں سکتے۔ انسان کے جسم کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر اس کی آنکھیں تو خاص طور پر جہنم کی مٹی سے بنائی گئی ہوں گی۔''

○ ○ ○

"معاف کیجیے، دراصل۔۔۔" حویلی کی پشت پر واقع کھوکھلے پیڑوں کے جنگل میں چلتے ہوئے اس نے بہت دیر کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔" میرا اس بوڑھے تک پہنچنا اپنے آپ میں ایک معزوہ سے کم نہیں تھا جسے میں چاہتا ہوں کہ آپ سنیں۔ نہ سننا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس نے اسے بتایا کہ نہ سننے کا اس کے پاس کوئی جواز موجود نہ تھا۔

"یہ بہتر ہے۔ آخر ہم کسی جبریہ سماج میں زندہ تو ہیں نہیں کہ بلا وجہ دھر پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے ڈال دیے جائیں۔ نہ ہی یہاں ایک دوسرے کو رد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں کسی مضبوط وجہ کی دریافت کرنی پڑے۔"

اور یہ کچھ برس پہلے کی بات تھی جب وہ اپنے گھر سے تھک چکا تھا اور فرار کے راستے ڈھونڈ رہا تھا (میں نے گھریلو ذمہ داریاں کبھی قبول نہیں کیں اس لیے میرے جیسے آدمی کے لیے گھر چھوڑنا اتنا ہی آسان تھا جتنا ایک کوا کے لیے اس کا گھونسلا چھوڑنا جس کے سارے انڈے خراب ہو چکے ہوں۔) یہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ اخبار کی ایک سرخی نے جس کا تعلق اس کھوکھلے پیڑوں والے جنگل سے تھا اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اس علاقے کے سارے کنویں اور تالاب اچانک سوکھ گئے تھے، یہی نہیں اس کے سارے پیڑ پودے بڑی تیزی سے کمہلانے لگے تھے۔ اس خبر سے وہ بے چین ہو اٹھا تھا، اسے لگا یہ واقعہ قدرت کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی پیغام ہے۔ جب وہ اس جگہ کے لیے نکلا تو اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ صرف گھن کھائے ہوئے پیڑ تھے، جنگلی کنٹیلی جھاڑیاں تھیں اور کچھ گھر جن کے مکین پانی کی آس چھوڑ چکے تھے، پریشان تھے اور نقلِ مکانی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ایک جگہ اس نے

ایک فال گو کو دیکھا جس کے پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ ایک لمبی چھڑی اٹھائے ہوئے تھا جس سے ایک ڈوری لٹک رہی تھی اور زمین کے اندر پانی کا سراغ لگانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ خود اس پرانے مکان میں آنے کے بعد جو پہلی چیز اس نے دیکھی وہ تھا اس کا کنواں تھا جو پیچھے کے باغ میں، جس کی چہار دیواری ڈھ چکی تھی، واقع تھا۔ وہ دیر تک اس کنویں کی منڈیر پر ہاتھ رکھے کھڑا اس کے اندر تاکتا رہا۔ کنواں سوکھا پڑا تھا۔ کافی گہرا ہونے کے سبب اس کا پیندا تاریکی میں گم تھا۔ اس وقت اس جگہ ایک عجیب سناٹا تھا جیسے زمین کا آخری انسان اپنے شور شرابے کے ساتھ رخصت ہو چکا ہو۔ (میں کنویں کی منڈیر پر ہاتھ رکھے اس کی لوہے کی چرخی کی طرف تاک رہا تھا جب مجھے ایسا لگا جیسے کنویں کے اندر سے کوئی مجھے بلا رہا ہو۔ میں نے سوچا یہ اس جگہ کے گہرے سناٹے کے سبب ہے۔ کاش میں نے اس آواز کی طرف توجہ دی ہوتی!)

وہ جب بوڑھے کے پاس وارد ہوا تو وہ پیڑ کے نیچے اسی طرح بیٹھا اپنے سر کے بال توڑ رہا تھا۔ اس نیم بہرے بوڑھے تک اس کی باتوں کی رسائی بڑی مشکل سے ہو پا رہی تھی، مگر تھوڑی ہی دیر کے اندر اسے پتہ چل گیا کہ اس تک اپنی بات پہنچانے کے لیے اور سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری تھا کہ ہوا کا رخ کس سمت ہے۔

''تمھیں لگتا ہے تم یہاں رہ سکتے ہو؟' پکی ہوئی بھوؤں کے نیچے سے بوڑھے کی زرد پتلیاں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ 'یہاں آدھے میل تک پانی کا نام و نشان نہیں۔ تم نے پیڑوں کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ کتنی تیزی سے سوکھ رہے ہیں۔''

بوڑھے کو کیا لگتا ہے، اس نے دریافت کیا تھا۔ ایک پورے علاقے کا اس طرح پانی سے محروم ہو جانا کیا کوئی ایسا واقعہ ہے جو بہت زیادہ دنوں تک قائم رہ سکتا ہے۔ اس نے راستے میں ایک جادوگر کو دیکھا ہے جو پانی کی تلاش میں گھوم رہا ہے۔

بوڑھے کی رقیق آنکھیں ایک پل کے لیے زندہ ہو گئی تھیں۔ وہ اجنبی کی طرف

عجیب نظروں سے تاک رہا تھا جیسے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے سر ہلا کر مایوسی کا اظہار کیا۔ ہاں، کچھ لوگوں نے یہ سوچا ہوگا۔ لوگ طرح طرح کے ٹونے ٹوٹکے کرواتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک لڑکے کی بلی دینے کی خبر بھی گرم ہوئی جو پولس کو اس علاقے میں کھینچ لائی۔ انھوں نے تو اس کے کنوین تک کو کھنگال ڈالا اور اسے اپنی بندوق تھانے میں جمع کرنی پڑی۔ مگر، (اور بوڑھے نے مجھے اس طرح یقین دلانے کی کوشش کی جیسے اس کے وجود کا سارا دارومدار اس ایک بات پر ہو) اس کے کنویں کا سوکھنا تو اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن وہ پیدا ہوا۔ اور آج جو آدھے میل دور سے بھوپال پانی لے کر آتا ہے یا سرکار کے ٹینکر پانی لے کر آتے ہیں تو یہ ایسا نہیں ہے کہ ایک دن اس نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کنویں کے پیندے میں ایک قطرہ پانی باقی نہ بچا ہو۔ یہ ایسا بھی نہیں جو صرف اسی علاقے تک محدود ہو۔ یہ دنیا اسی سمت جا رہی ہے۔ اس نے جب پیڑوں کو سوکھتے، اس کے اندر کھوکھلے پن کو پروان چڑھتے اور دیمک کو مٹی کی سرنگ بنا کر اندر جاتے دیکھا تو دیر نہ کی، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ اس نے بھوپال کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اسے اچھا اچھا کھانا کھلایا، پستہ اور بادام سے اس کی خاطر کی اور ایک صحت مند کنواری کا وعدہ بھی کیا۔ اس وقت بھوپال کی عمر ہی کیا تھی۔

اور وہ سارا پانی، جو زمین کے نیچے تھا، آخر اس کا کیا بنا؟ اس اطراف میں تو اتنی بڑی آبادی بھی نہیں ہے، نہ کل کارخانے ہیں، نہ ہی آبپاشی کے لیے کوی نہر نکالی گئی ہے جو اس کی ندی کا سارا پانی بہا کر لے گئی ہو۔

"تم کس ندی کی بات کر رہے ہو؟ وہ تو برسات کے ایک آدھ مہینوں کو چھوڑ کر ریگستان میں بدل جاتی ہے۔ یوں بھی، زمین کے اندر بھی تو ایک دنیا آباد ہے۔ اس کی پیاس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔"

''میں اس کنویں کے پیندے میں اترنا چاہونگا۔''

''وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''بوڑھے نے اپنی پکی ہوئی بھوؤں کے کونوں کو اینٹھتے ہوئے کہا۔''میں بھوپال کو اس میں اتار چکا ہوں۔اس سے اب پانی کی امید بیکار ہے۔''

''میں بھوپال سے بات کرنا چاہونگا۔''

''وہ پیدائشی گونگا ہے۔''

○ ○ ○

دونوں نیم مردہ پتوں پر چل رہے تھے جو کسی حالیہ آندھی کے سبب زمین پر آگرے تھے۔ کچھ درختوں پر مٹی کی لکیریں شاخوں ٹہنیوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔یہ مٹی کی وہ سرنگیں ہیں جنھیں دیمک کے کیڑے آمدورفت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ (اور میں جب کنویں کے اندر اترا تو میں نے ان لکیروں کو وہاں بھی پایا۔) اسے حشرات الارض کی عادتوں کے بارے میں کوئی علم نہیں، مگر اسے یقین نہیں ہوتا کہ وہ اس کنویں میں اترا تھا۔

اسے یقین کرنا چاہئے، آخر یہ اتنا بڑا کارنامہ تو تھا نہیں۔بھوپال کی مدد سے رسی سے بندھے ہوئے ڈول کے اندر پاؤں رکھ کر کوئی بھی اس کے پیندے میں اتر سکتا تھا خاص طور پر جب اس کی چرخی اب بھی کام کر رہی ہو۔ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی کنویں میں پہلی بار اترا تھا۔مگر اس سے پہلے اسے جن کنوؤں سے واسطہ پڑا تھا ان میں پانی بھرے ہوتے تھے جب کہ یہ کنواں پانی سے خالی تھا اور بہت نیچے ہونے کے سبب اس کا پیندا گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پیندے میں اتر کر اس نے دیکھا اس کی مٹی بہت ہی ملائم اور بدبودار تھی۔آکسیجن کی کمی کے سبب شروع شروع میں اسے لمبی لمبی سانس لینی پڑ رہی تھی۔اسے اس بات کا ڈر نہ تھا کہ کنویں کے اندر زہریلا گیس ہوسکتا ہے

کیونکہ بھوپال اس میں اتر چکا تھا۔ پہلے پہل کنویں کے اندر اسے بہت گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا مگر بہت جلد وہ اس کا عادی ہو گیا۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر دیکھا، چند سوکھی لکڑیاں اور ایک آدھ پتھر وہاں گرے ہوئے تھے جنھیں اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا شاید بھوپال نے کبھی اس کنویں کی گہرائی کو ناپنے کے لیے انھیں وہاں پھینکا ہو۔ (مجھے آپ کی ہمت کی داد دینی چاہیے۔ اگر بوڑھا رسی اٹھوا لیتا تو؟) بوڑھے نے رسی اٹھوا لیا تھا۔ وہ تین دن تک بھوکا پیاسا کنویں کے اندر پڑا رہا۔ پہلے دن اس نے متواتر انھیں آوازیں دیں۔ مگر جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، چیزیں آپس میں ایک طرح سے گڈمڈ ہوتی چلی گئیں۔ گرچہ وہاں اتنی تیرگی بھی نہ تھی کہ وہ کچھ نہ دیکھ پاتا۔ جب ایک انسان بہت دیر تک اندھیرے میں رہنے پر مجبور ہو تو اس کی آنکھیں کم سے کم روشنی میں بھی دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہیں بلکہ وہ ایسی چیزیں بھی دیکھنے کا اہل ہو جاتا ہے جنھیں وہ ساری زندگی دیکھنے سے قاصر رہا تھا۔ مگر، شاید وہ اسے اس کنویں کے اندر کا صحیح حال کبھی بتا نہ پائے۔ (پہلی رات جب میں نے ستاروں کو اپنے سفر پر رواں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میرے خدا، میں کس طرح اتنی لمبی زندگی جی کر بھی انھیں دیکھ نہ پایا تھا) یہ بہت ہی حیرت انگیز تھا، وہ ایک کنویں میں قید تھا مگر ستاروں کی ٹھنڈی روشنی کو اپنی روح کے اندر محسوس کر سکتا تھا۔ (اس کنویں کے اندر میں نے پہلی بار ایک عجیب نیند کا ذائقہ چکھا، ایسی نیند جو انسان کے وجود کی نفی کرتی تھی۔)

''تم اس خطرناک حالت میں کیسے سو سکتے تھے؟'' وہ ناگفتہ بہ سڑک پر چلتے ہوئے اپنے اس جملے کی گونج اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔

مقروض شخص شاید کبھی بتا نہ پائے کہ وہ اس کنویں کے اندر جاگا ہوا تھا یا وہاں مٹی کی مہک اور تاروں کی روشنی میں وہ خواب دیکھ رہا تھا؟ دن تو اس کے لیے ایک چمکتے ہوئے آسمان بھر تھا جو ایک نقرئی تھالی کی طرح کنویں کے منہ پر رکھا تھا۔ مگر یہ

آسمان کبھی کبھی دیوار کی بلندی یا شاید زمین کی گردش کے سبب فلس ماہی کی شکل اختیار کر لیتا۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے اس وقت وہ جو سوچ رہا تھا وہی دیکھ رہا تھا۔ دن تو جیسے تیسے گذر جاتا، مگر سورج کے غروب ہونے کے بعد کا وقفہ اس کے لیے نئے حیرتیں لے کر آتا جب دیکھتے دیکھتے نقرئی تھالی ماند پڑ جاتی اور اوپر کی دنیا اچانک غائب ہو جاتی۔ اس گم شدہ آسمان کی طرف تاکتے ہوئے اسے ایسا لگتا جیسے نہ صرف آسمان بلکہ خود اس کا وجود بھی غائب ہو چکا ہو۔ اسے تو اپنی گھڑی کی ٹک ٹک تک سنائی نہ دیتی جیسے وقت کا خاتمہ ہو چکا ہو۔ اپنے وجود کی نفی کا یہ احساس اسے ایک عجیب وغریب مسرت سے ہمکنار کر دیتا جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا۔ مگر یہ دیر پا ثابت نہ ہوتا۔ جلد ہی اس نقرئی تھالی میں کوئی تارا چھید کر ڈالتا۔ روشنی کی وہ ہلکی سی کرن اور پوری کائنات، اس کا اپنا وجود، یہاں تک کہ وقت اپنی ٹک ٹک کے ساتھ پورے شور شرابے کے ساتھ جاگ اٹھتا۔ اس وقت تو وہ ان کیڑوں مکوڑوں کو بھی سن سکتا تھا جو اوپر جنگل میں شور مچایا کرتے۔ عدم سے وجود میں آنے کا یہ کھیل رات بھر چلتا رہتا۔ مگر بیچ بیچ میں بھوک اور پیاس سے نڈھال نیم بے ہوشی کے عالم میں بھوپال کو پکارتا رہتا کیونکہ صرف یہی نام وہ جانتا تھا۔ (تم سوچ سکتے ہو کھو کھلے پیڑوں کے بیچ ایک ویران گھر جس میں ایک تقریباً بہرا بوڑھا اور ایک گونگا لڑکا رہتا ہو جس کی پیدائش کیفو راً بعد کبھی ٹرینیں اس کے اوپر سے گذر چکی ہوں اور ایک کنواں جس کے اندر سے رہ رہ کر انسانی چیخیں بلند ہو رہی ہوں جن کا سننے والا کوئی نہ ہو۔ کیا یہ تمھارے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی نہیں؟)

''کنووں کے اندر جن اور بدروحیں بھی ہوتی ہیں۔ تمھیں ان سے ڈر نہیں لگا؟''

''نہیں، اس کنویں کے اندر ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ بدروحیں تو اوپر کھوکھلے پیڑوں کے اندر کھسر پسر کر رہی تھیں؟''

''اور، تم اس کنویں سے باہر کیسے آئے؟'' اس نے ایک نوکیلے پتھر پر جوتے کی نوک رکھ کر سنسان جنگل سے کہا۔

''تمھیں کیا لگتا ہے، بوڑھا اتنا سنکی ہے۔'' جنگل کے اندر شاید کوئی ہنسا تھا۔'' مجھے اب بھی نہیں معلوم اس نے ایسا کیوں کیا، نہ میں نے پوچھا، نہ اس نے بتایا، مگر مجھے شبہ ہے وہ مجھے اس کنویں سے باہر نکالنے پر کسی دوسری وجہ سے مجبور تھا۔ اپنی تشفی کے لیے میں نے سوچا شاید اس لیے کہ میں نے اس کے اس ویران گھر میں رہنا منظور کیا تھا جس کی اوپر کی منزل اب ناقابل رہائش ہو چکی تھی۔''

''پھر بھی فرض کرلو۔ اگر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہوتا تو۔ ایک بوڑھے کی یادداشت کا کیا بھروسہ؟''

''تو میرے پاس کھونے کے لیے کیا تھا اور اس سے اہم بات، میرے پاس کرنے کے لیے کیا تھا؟'' وہ ہنسا اور اس کی ہنسی کی تقلید کرتے ہوئے ایک بار پھر کھوکھلے پیڑ ہنس پڑے۔''میں تمھیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ بظاہر رسی تھامے، ڈول کے اندر پاؤں رکھے ایک آدمی کنویں سے باہر آیا تو تھا، مگر وہ میں نہ تھا؟ وہ ہرگز میں نہ تھا۔ سچ پوچھو تو میں اس کنویں سے کبھی باہر آیا ہی نہیں۔''

○ ○ ○

وقت کافی گذر چکا ہے۔ زرد دھوپ گانٹھ دار تنوں پر اتر آئی ہے۔ نزدیک و دور پتے لگاتار گر رہے ہیں بلکہ وہ ایک آدھ مکڑے کو بھی دیکھ سکتا تھا جو اپنے نہ نظر آنے والے تاروں پر پھسلتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے، اوپر کی طرف جا رہے تھے۔ دور آسمان میں ایک طیارا کسی پرندے کی طرح نمودار ہوا، یا شاید وہ سچ مچ کوئی پرندہ تھا جس نے طیارے کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔

''چلئے میں آپ کو مالک مکان سے ملواؤں۔ آجکل ان پر عجیب وغریب دورے

پڑنے لگے ہیں۔" اس نے گویا مہمان کو خواب سے جگاتے ہوئے کہا اور دونوں واپس مکان کے اندر چلے گئے۔ سیمنٹ کا ایک سرخ برامدہ طئے کرتے ہوئے وہ اندرونی صحن سے گذرے جس کے اوپر کھلا آسمان تھا۔ صحن کا فرش موزیک کے ٹائل کا بنا ہوا تھا۔ یہ ٹائل جہاں جہاں اکھڑ گئے تھے ان جگہوں کو سفید سمینٹ سے بھر دیا گیا تھا۔ صحن کے وسط میں ایک حوض کے اندر فوارہ ناکارہ پڑا تھا۔ حوض کے گندے پانی میں پرندوں کی بیٹ اور سوکھے پتے تیر رہے تھے۔ مکان کے بڑے چوبی دروازے کے باہر سیمنٹ کا وہی سرخ برامدہ تھا جس سے گذر کر ہم لوگ صحن کے اندر داخل ہوئے تھے۔ برامدے کی اونچی دیوار پر مٹی کے کچھ ٹوٹے پھوٹے گھڑے اب بھی لٹک رہے تھے۔ ا ن گھڑوں کے نیچے سے نکلی ہوئیں بیٹ کی لمبی لمبی لکیریں اس دور کی یاد دلا رہی تھیں جب اس حویلی نما مکان میں زندگی کی چہکاریں گونجا کرتی تھیں اور خوشحالی کے پیغام لانے والے کبوتروں نے اسے اپنا بسیرا بنا رکھا تھا۔ بوڑھا برگد کے پیڑ کے نیچے اپنی بید کی کرسی پر بیٹھا آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ لڑکا اس سے تھوڑے فاصلے پر دائمی طور پر کھلے ہوئے پھاٹک کے قریب کھڑا پلاسٹک کے تار پر گیلے کپڑے پھیلا رہا تھا اور زیر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ کیا گونگے بڑبڑایا کرتے ہیں؟ یا یہ کسی پرندے کی آواز ہے جو پیڑ کے اندر چٹر بٹر کر رہا ہے۔

"اور ابھی تھوڑی دیر قبل وہ یہاں نہیں تھا۔" مہمان نے سرگوشی کی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے آپ کے اور اس کے وقت کا ڈائمینشن الگ ہو۔" اس نے ضد کی۔ "کیا ہم کسی چیز کو اس وقت تک دیکھ پاتے ہیں جب تک ہم اسے اپنی سوچ میں جگہ نہ دیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، جانے آنکھیں ہمارے کسی کام کی ہیں۔"

آخر کار دونوں بوڑھے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

ٹھوڑی سینے پر ٹکی ہوئی تھی اور سر پر روکھے سوکھے بال مردہ جھاڑیوں کی طرح کروفر سے تنے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں کندھے اونٹ کی ایک خاص نسل کے دہرے کوہان سے الگ نہ تھے جو سانسوں کی آمد و رفت کے زیر اثر عجب انداز سے کانپ رہے تھے۔ اس کی مڑی ہوئی انگلیوں پر شوخ رنگوں والے پتھروں کی نگہبانی تھی جن میں چیتا کی آنکھ صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

''یہ ایک توہم پرست انسان ہے اور اب یہ زیادہ دن تک زندہ رہنے والا نہیں۔''

''اسے اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' وہ کہتا ہے اور دور شہر کی طرف اپنی انگلی سے اشارا کرتا ہے گرچہ پیڑوں کی دخل اندازی کے سبب اس کا یہاں سے نظر آنا ممکن نہ تھا۔ ''اس شہر میں میں نے ساری زندگی گذار دی۔ آپ کو تو پتہ ہوگا، وہاں جینا کتنا مشکل ہے، کتنے سارے لوگ، کتنے سارے کاغذات، حکومتِ وقت کا سنگین چہرا اور اس کے عملے جنھیں ابنائے وطن کے ساتھ سدومت کی خاص ٹریننگ دی جاتی ہے۔''

''اور یہاں آ کر کیا آپ نے ان سب چیزوں سے نجات حاصل کر لی ہے؟''

''نہیں نہیں۔ آپ غلط نہ سمجھیں۔ میں کوئی سیاسی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' اس نے مداخلت کی۔ ''مگر کیوں نہیں۔ میں نے ایک دوسری طرح کے قید خانے کو اپنا ٹھکانہ بنایا ہے۔ ہاں، وہ لوگ یہاں بھی آ پہنچتے ہیں، انھیں تو آپ اپنی خوابگاہ میں بھی داخل ہونے سے نہیں روک سکتے جب کہ آپ مباشرت کے عمل میں مصروف ہوتے ہیں۔''

''بھوپال۔۔۔'' بوڑھے نے ایک آنکھ کھول کر ہانک لگائی جب کہ وہ کاغذ اپنے آدمی کی طرف بڑھا کر کاپی پر بطور رسید اس کا دستخط لے رہا تھا۔

''یہ آپ ہر بار کرتے آئے ہیں۔'' وہ لاپرواہی سے دستخط کر کے کاپی لوٹا دیتا ہے اور اب اپنی کاپی پر نظر دوڑا رہا ہے۔ ''وہی سارے الفاظ، تیور تھوڑے سے کڑے، کتنا کڑا ہو سکتا ہے انسان کا تیور؟ اور ان سب چیزوں کا خاتمہ آخر کیا ہے، ایک پولس کا ڈنڈا یا

اس کی بندوق سے نکلی ہوئی گولی یا سرکاری خرچ پر خریدا ہوا پھانسی کا پھندا۔ انسان کی آزادی کی قیمتیں جنھیں ہر حال میں وہ چکانے پر مجبور ہے۔"

لڑکا بوڑھے کے پاس نہیں آیا ہے۔ شاید رہ رہ کر اسے اس طرح کی بانک سننے اور رد کرنے کی عادت ہے۔ یا شاید گونگے بہرے بھی ہوتے ہیں۔

"اب میرا کام ختم ہوگیا ہے۔" وہ رسید اپنی ہینڈ بیگ کے اندر رکھ کر کہتا ہے۔ "شاید اب آپ کو عدالت میں حاضری دینی پڑے۔"

"یعنی وہی قانون کی سختی، پولس کی بیڑیاں، دھر دبوچنے والے لوگ۔ کبھی کبھی مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے یہ ہماری عظیم الشان تہذیب کن بنیادوں پر استوار ہے۔" وہ ہنستا ہے اور جھک کر بوڑھے کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ بوڑھا مسکرا رہا ہے۔ اس کے منھ کے اندر کچھ دانت اب بھی قائم ہیں۔ اس نے اپنی ایک آنکھ سے میرا جائزہ لیا ہے اور اشارے سے مجھے اپنی طرف جھکنے کے لیے کہتا ہے۔ میں اس کے منھ کے پاس اپنا کان لے جاتا ہوں جسے وہ اپنی استخوانی انگلیوں سے تھام کر کچھ کہتا ہے۔ میرے کان پر اس کی انگلیوں کی ہڈیاں چبھ رہی ہیں جیسے وہ انسانی انگلیاں نہ ہوں بلکہ کسی جانور کا پنجہ ہو۔ وہ یقیناً کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کے منھ سے ایک ناقابل برداشت مہک آرہی ہے جو شاید پیر سالی کا نتیجہ ہو یا شاید وہ نشہ خورانی کا شکار ہو۔ اس کے الفاظ آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو رہے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ بھوپال کے بڑبڑانے یا کسی پرندے کے چٹر بٹر کرنے سے کچھ الگ نہ تھا۔ آخر کار بوڑھا ہار مان کر بے چارگی کے ساتھ میرے آدمی کی طرف تاکتا ہے۔

"چھوڑیے بھی، یہ اتنا اہم نہیں ہے۔" مقروض کندھے سے تھام کر مہمان کو دلاسا دیتا ہے۔ اور ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔ "جیسے الفاظ واقعی اس قابل ہوں کہ کچھ بیان کرسکیں۔"

○ ○ ○

قومی شاہراہ سے دور ٹوٹی پھوٹی ذیلی سڑک کے کنارے کی جھاڑیوں سے بچتا ہوا وہ چل رہا ہے۔ دونوں طرف کے کھیت ننگے ہیں۔ انھیں ہل کا زخم کھائے زمانہ ہو چکا ہوگا۔ وہ ایک جگہ رک کر ایک استخوانی جھاڑی سے الجھے ہوئے سانپ کی کینچلی کو غور سے دیکھ رہا ہے جب ایک سائکل سوار نمودار ہوتا ہے۔ اس کا چہرا سپاٹ ہے۔

''شاید آپ کو اس نئے راستے کا علم نہیں۔'' وہ رک کر کہتا ہے۔ اس کے دانت نوکیلے اور بے ڈھنگے ہیں۔ جانے وہ ان سے کیا کام لیتا ہوگا۔ ''یہ راستہ بھی اسی طرف جاتا ہے جہاں سے ہمیشہ آپ کی واپسی ہوتی ہے۔''

''شاید اگلی بار میں یہ راستہ اپنالوں۔'' وہ جواب دیتا ہے جسے سائکل سوار سننے کے لیے نہیں رکتا۔ وہ دیر تک اس کے پچھلے پہیئے کو دھول اڑاتے دیکھتا رہتا ہے اور دوبارا سانپ کی کینچلی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اب بھی لرز رہی ہے جیسے سانپ ہوا میں اپنا دستخط چھوڑ گیا ہو۔ وہ اپنے ہینڈ بیگ کا زپ کھول کر نوٹس نکالتا ہے اور اس کے نیچے کیے گئے دستخط کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ ہماری تاریخ میں انسانی رشتوں کو بگاڑنے اور سنوارنے میں نوشتہ تحریروں نے کتنا بڑا رول ادا کیا ہے۔ تحریریں بری ہوتی ہیں کیونکہ وہ آپ کو قید کرتی ہیں، اپنی ہر لکھی ہوئی تحریر کے ساتھ آپ نہ صرف تھوڑا بہت کھل جاتے ہیں بلکہ اپنی آزادی کا تھوڑا حصہ بھی کھو دیتے ہیں۔ آپ بنیادی طور پر ایک آزاد انسان ہوتے ہیں مگر پھر آپ اپنے لیے زنجیریں ڈھالنے لگتے ہیں اور خود ان کے شکنجے میں آجاتے ہیں۔ ہاں، یہ کام کوئی اور آپ کے لیے نہیں کرتا۔ میں نے ایک لمبی زندگی گذاری ہے۔ مجھے ان زنجیروں کا علم ہے۔ ریت میں سر چھپا کر اکثر میں ایک آزاد انسان ہونے کا سوانگ رچاتا رہتا ہوں۔ مگر کیا میں واقعی ایک آزاد انسان

ہوں صرف اس لیے کہ میں ایک آزاد ملک کا باشندہ ہوں جسے کہیں بھی جانیکی آزادی ہے۔شاید اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ دھیرے دھیرے آپ کو پتہ چل ہی جاتا ہے کہ آپ ایک بڑی سازش کا حصہ ہیں جہاں سب کچھ ایک طئے شدہ پروگرام کے تحت چلتا ہے اور اس سازش میں آپ خود بھی شریک ہیں۔اور وہ آتش فشاں، شاید اسے بھی اس بات کا علم نہ ہو کہ اس کی حیثیت بھی ایک بڑی مشین کے پرزے سے زیادہ کی نہیں ہے۔اس صورت میں اگر میں نے اس کاغذ کے پرزے پرزے کر دیے تو بھی کہیں پر کچھ بدلنے والا نہیں۔لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تو شاید مجھے سانس لینے میں دشواری ہو۔وہ زیادہ وقت نہیں لیتا۔لیکن ابھی کاغذ کے پرزے پوری طرح ہوا میں منتشر بھی نہ ہوئے ہونگے کہ وہ دیکھتا ہے وہ ایک بالکل نئے آسمان کے نیچے کھڑا ہے۔وہ حیرت سے اپنے چاروں طرف نظریں دوڑا رہا ہے۔یہ پیڑ، یہ جھاڑیاں، یہ اتنے چپ کیوں ہیں؟ یہ آسمان، کیا واقعی یہ موجود ہے یا یہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا فریب ہے جسے ہم آخری سانس تک ڈھوتے رہنے پر مجبور ہیں؟ کیا ہم اس کے نیچے محض نقل و حرکت کرنے والے جانور ہیں یا واقعی ہم نے اس دنیا کو بدلا ہے؟ اور دھیرے دھیرے قدم رکھتے ہوئے اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ واقعی ایک جانور ہو جس کے پاس دنیا کو دینے کے لیے صرف ایک جسم کے علاوہ اور کچھ بھی نہ ہو۔

وہ تھوڑی ہی دور چلا ہوگا کہ تارکول کا ایک بالکل نیا راستہ کھیتوں کے بیچ سے کسی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا نکل آتا ہے اور اسی طرح بل کھاتا ہوا کھو کھلے پیڑوں کے جنگل کے اندر گم ہو جاتا ہے۔جنگل، جو لگتا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دائمی خاموشی میں ضم ہو چکا ہے۔

وہ تھوڑی ہی دور چل پایا ہوگا کہ اسے وہ پرانا مکان دکھائی دیتا ہے جو اب پہلے کے مقابلے کچھ اور دھندلا پڑ گیا ہے۔اس کی بالائی منزل پر کھپریل کے چھپروں میں

ایک عجیب افراتفری نظر آ رہی ہے جیسے کوئی طوفان حال ہی میں ان پر سے گزر چکا ہو۔ ایک جگہ چھپر کے بیچوں بیچ اتنا بڑا سوراخ بن گیا ہے کہ اسے زمین پر کھڑے کھڑے دیکھا جا سکتا ہے۔

وقت، میں اسے کہاں چھوڑ آیا ہوں؟

بے جان پودوں کے درمیان بید کی نڈھال کرسی پر بوڑھے کی جگہ مقروض شخص بیٹھا اس کی طرف شرارت بھری نظروں سے تاک رہا ہے۔ اسے حیرت ہوتی ہے۔ پہلے کے مقابلے اس کی عمر کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ اس نے کس طرح اس انسان کو اپنے اندر چھپا رکھا تھا؟

''خوش آمدید!'' وہ کہتا ہے۔ ''بادل اپنا فرض نہیں نبھاتے، کلنڈر کے صفحے پرانے ہو جاتے ہیں یا ہم انھیں پلٹنا بھول جاتے ہیں، ربر کے پہیوں پر نئی پرتیں چڑھا دی جاتی ہیں، ہمارے دانت گرنے لگتے ہیں، وقت گذر جاتا ہے اور ہمیں اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور یہ تھوڑے ہی دنوں پہلے کی بات ہے جب آپ نے اس کرسی پر بوڑھے کو اپنی ایک آنکھ کھولتے دیکھا تھا۔ اب اس کی دونوں آنکھیں ہمیشہ
ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی ہیں۔''

''جس کے ساتھ ہی کیا وہ ایک بہتر انسان میں نہیں ڈھل گیا ہے۔'' میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہوں۔ ''جو ثابت کرتا ہے کہ انسان کا نہ ہونا کے اس کے حق میں اچھا ہی ہے۔ مگر بھوپال؟ میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں جب کہ میں جب بھی آیا ہوں پہلی چیز جس پر میری نظر پڑی ہے، وہ بھوپال ہی تھا۔''

''بھوپال، وہ اب یہاں نہیں رہتا۔ بوڑھے کی موت کے بعد وہ کچھ دنوں تک آس پاس کے جنگلوں میں نیم پاگل سا گھومتا پھرا۔ اب کوئی نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔ افواہ یہ بھی ہے کہ اس کا اغوا کر لیا گیا ہے اور وہ پہاڑوں میں باغیوں کے ساتھ

گھومنے لگا ہے۔ اگر پولس کی سنیں تو بارودی سرنگ بچھانے میں آج بھوپال کا کوئی ثانی نہیں۔"

وہ دم بخود اس کی طرف تاک رہا ہے۔ برگد سے لٹکتی جڑوں میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ مگر پتوں میں چھپی ہوئی کوئی چڑیا بڑبڑا رہی ہے جیسے بھوپال یا بوڑھا آس پاس کہیں پر موجود ہو۔

"ایک طرح سے دیکھا جائے تو آپ نے غلط نہیں کہا ہے کہ انسان کا نہ ہونا اس کے حق میں اچھا ہی ہے۔" وہ اپنی ایک آنکھ بند رکھنے کی کوشش میں کسی مسخرے کی طرح نظر آرہا ہے۔ "مگر کوئی بھی بات کہہ لیں، آخر میں اس کے اندر کیا رہ جاتا ہے۔ ہر لفظ کو ہم ڈھول کی طرح پیٹتے ہیں تاکہ اس سے آواز ابھر سکے مگر واقعہ یہ ہے کہ الفاظ جتنے کھوکھلے ہوتے ہیں آواز اتنی تیز سنائی دیتی ہے۔ معاف کیجیے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اب میں آپ کے کسی کام کے لائق نہیں رہ گیا ہوں۔ کیا اب پولس آدھمکے گی؟"

"نہیں۔" میں کہتا ہوں۔ "گرچہ اب بھی میں کمپنی کے سفر پر ہوں، مگر میرا اس بار آپ کے پاس آنا اور ہی کسی مقصد کے تحت ہے۔ مجھے آپ کا تھوڑا سا وقت چاہیے۔ اپنے کام کے دوران مجھے بہت سارے شہروں میں گھومتے رہنے اور رہائش اختیار کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران میں کبھی ایک شہر گناہ میں جا نکلا جہاں ایک دریا بہتا تھا جو بہت ہی گہرا تھا۔ اس شہر میں جانے انجانے میں ایک ایسے راز تک پہنچ گیا جسے میں نے عرصے سے اپنے سینے کے اندر چھپا رکھا ہے۔ کیا میں اپنا بوجھ ہلکا کر سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں، اس کام کے لیے میں بہت ہی مناسب آدمی ہوں۔" وہ جھک کر انکساری سے کہتا ہے۔ "مگر مجھے افسوس ہے آپ کو میں دوسری کرسی پیش نہیں کر سکتا۔ اگر پیر سالہ مرحوم کے ساتھ ہم ایمانداری سے پیش آئیں تو یہاں اس کی اجازت نہیں ہے۔"

○ ○ ○

رات کس قدر ہے دراز

یا دم آید ز زلف او ای دل
باز گوئی بما شب است دراز

خسرو

یہ ایک جادوئی پیڑ تھا۔ اس کے پھول سیر یخ کی طرح لانبے تھے اور اس پیڑ سے ایک عجیب طرح کی خوشبو آتی جو آدمی کو خواب دیکھنے پر مجبور کرتی۔

یہ پیڑ میرے نانا کے باغ میں ایک اونچی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اپنے آخری دن گن رہا تھا۔ دیوار کے دوسری طرف جہاں پرانا تالاب تھا، کچے راستے پر بیل گاڑیوں کے پہیے چرخ چوں کیا کرتے۔

میں اپنے کمرے میں کھڑکی کی سلاخوں کو تھامے کھڑا اس درخت کو دیکھا کرتا اور سوچتا اگر یہ پیڑ نہ ہوتا تو یہ ناقص سا باغ جس کے زیادہ تر پیڑ بوڑھے ہو چکے ہیں، کتنا مضحکہ خیز نظر آتا۔

یہ تھوڑے دنوں پہلے کی بات ہے کہ میں نے اپنا بارہویں کا امتحان پاس کیا تھا اور اب کچھ دنوں کے لیے نانا کے گھر آگیا تھا۔ ہمیں نانا کے گھر کے لیے ٹرین میں ساری رات کا سفر طئے کر کے علی الصباح ایک بڑے اسٹیشن میں اترنا پڑتا جہاں مسافروں کی

ریل پیل ہوتی۔ وہاں ہمیں لینے کے لیے ایک چھوٹی ٹرین آتی جو بجلی اور ڈیزل کے اس دور میں بھی اسٹیم کی طاقت سے چلا کرتی۔ اس ٹرین کے راستے میں ندیاں نالے اور ہرے بھرے کھیت بکھرے پڑے تھے جن پر لوہے کی پٹریاں بل کھاتی ہوئی افق تک چلی گئی تھیں۔ ٹرین کے اندر لکڑی کے بینچ پر بیٹھے بیٹھے کھڑکیوں سے باہر نیلے پہاڑوں کی طرف تاکتے ہوئے اکثر ہمیں لگتا جیسے یہ ٹرین ہوا کے دوش پر سوار ہو۔

یہ ٹرین گھونگے کی رفتار سے چلتی ہوئی کئی گھنٹے بعد، زیادہ تر غروبِ آفتاب سے تھوڑی دیر قبل، ہمیں نانا کے قصبے کے اجاڑ سے اسٹیشن میں، اس کے سنسان پلیٹ فارم پر چھوڑ جاتی۔ اس پلیٹ فارم پر مسافروں کے لیے کوئی سائبان نہ تھا، صرف انگریزوں کے زمانے کی ایک بیرک نما عمارت تھی جس کے اندر اسٹیشن ماسٹر کا دفتر تھا۔ میں اس کے پلیٹ فارم پر کھلے آسمان کے نیچے اپنا رک سک پیٹھ پر تھامے اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک ٹرین دھواں اگلتی ہوئی اپنی ٹنل میں نہ کھو جاتی جو اسٹیشن سے تھوڑی ہی دور واقع تھی۔

رک سک پیٹھ پر سنبھالے میں جب اس کم مصروف اسٹیشن سے باہر آتا تو سوچتا، یہ سفر، یہ اتنا برا تو نہیں۔ اور پھر نانا کے باغ میں کتنے انواع واقسام کے پیڑ پودے بکھرے پڑے ہیں جن کے الگ الگ چہرے ہیں، الگ الگ تاریخیں ہے، گرچہ حال کے برسوں میں ان میں سے کچھ پرانے پیڑ جنھیں اندر سے دیمک نے کھوکھلا کر ڈالا تھا، کاٹ ڈالے گئے ہیں۔

میرے نانا کبھی اپنے قصبے سے باہر نہیں گئے۔ انھوں نے کبھی اخبار نہیں خریدا۔ ان کے ملاقاتی قصبے سے باہر کی دنیا کے بارے میں ان سے کسی طرح کی گفتگو نہ کر پانے کے سبب قصبے کے گلی کوچوں، اس کے گھر آنگن، آس پاس کے میلوں ٹھیلوں اور پرب تہوار میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں گفتگو کرنے پر خود کو مجبور

پاتے۔ نانا لانبے قد کے ایک تندرست اور بلا کے محنتی انسان تھے۔ ان کی کشادہ پیشانی اور دانشمند آنکھوں سے ایک سماں سا بندھ جاتا۔ ان کی نماز کی ادائگی قابل دید تھی اور جب ان کے بارے میں ساری باتیں کہہ لی جاتیں تو ایسا لگتا جیسے ابھی بھی کہنے کے لیے بہت کچھ باقی رہ گیا ہو۔

''جب بجلی کے مینار ہمارے کھیتوں میں پہلی بار کھڑے کئے گئے۔۔'' انھوں نے اپنی یادداشت کے کونوں کو کھنگالتے ہوئے ایک دن دسترخوان پر کہا تھا'' ۔۔۔ تو کسان بہت بے چین نظر آئے۔ کسی نے انھیں غلط سمجھا دیا تھا کہ کھیتوں میں ان کے بدولت کبھی بھی آگ لگ سکتی ہے۔ گرچہ ہمیں اس میں یقین نہ تھا مگر ان کی تشفی کے لیے ہمیں چھوٹی ٹرین میں بیٹھ کر محکمہ برقیات کے اسٹنٹ انجینئر کے پاس جانا پڑا جو ہمارے قصبے کا انچارج تھا۔ اس کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ رہ رہ کر اس کی یادداشت کھو جاتی اور وہ ہفتوں اپنے گھر میں بیٹھا رہتا۔ شاید اس کی ازدواجی زندگی میں کوئی بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اس نے آفس میں ہم سے ملنے سے انکار کر دیا۔ تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلی بار شہر جا کر اس کے اوپر کے افسر کے سامنے اپنی بات رکھونگا۔ ہم کئی مہینے تذبذب میں مبتلا رہے۔ کسان دحات کے ان ڈھانچوں سے خوفزدہ جو کھیتوں میں کسی دیوی کی طرح اپنے آہنی ہاتھ پھیلائے بجلی کے تار اٹھائے کھڑے تھے، اپنی دانست میں ان سے ایک محفوظ دوری قائم رکھتے اور ان کی طرف نہ تاکتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہا کرتے۔ دنیا کی کوئی طاقت انھیں ان کے نیچے جانے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ اور تب ایک دن انھوں نے اس اسٹنٹ انجینئر کو دیکھا۔ وہ اپنے دانتوں کے بیچ ایک پیچ کش دبائے ایک مینار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے بجلی کے جھٹکے سے گر کر مارا گیا۔''

''پھر کسانوں نے ان ڈھانچوں کا کیا کیا؟'' میں نے سانس روک کر پوچھا تھا۔

"کس میں ہمت تھی کہ ان کے قریب جائے۔" نانا نے جواب دیا۔" آج بھی یہ دھات کے مینار اپنے بجلی کے تار اٹھائے اپنی جگہ کھڑے ہیں، گرچہ اب کسان ان سے خوف نہیں کھاتے اور عین ان کے نیچے کھڑے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ میرے بچے، وقت دھیرے دھیرے انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔"

میں نانا کی باتیں غور سے سنتا مگر جانے کیوں، مجھے ان کی باتوں پر یقین نہ آتا۔ میں سوچتا، ایک ایسا آدمی جو زندگی میں کبھی اپنے قصبے سے باہر نہ گیا ہو، اس سے کسی طرح کی دانشمندی کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔

اندرونی برامدے میں کھڑا میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا جب چاند نے اپنی نقرئی چادر سے اس جادوئی پیڑ کو ڈھک لیا۔ اسے جادوئی پیڑ اس لیے کہا جاتا کیونکہ اس پر جگنو کثیر تعداد میں اترا کرتے اور اس کے سیرنج نما پھولوں کا رس پینے کے لیے مڑی ہوئی چونچ والی ارغوانی رنگ کی چڑیاں آتیں۔ نانا انھیں گلدم کے نام سے پکارتے۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان چڑیوں کا تعلق شکرخورے کی نسل سے تھا۔ ان میں سے کبھی کبھی کوئی چڑیا کوئی پتلی سی ٹہنی کو اپنی چونچ سے تھام کر دیر تک ہوا میں جھولتی رہتی۔

"میاں کچھ سوچت ہیں؟" مجھے ایک نحیف آواز سنائی دی اور میں نے دیکھا برامدے کے بینچ پر نانا کے کوچوان بیٹھے تھے۔ وہ ایک دنیا سے شکست کھایا ہوا بوڑھا آدمی تھا، جس کی ٹھوری سینے پر ٹکے ہونے کے سبب کھچڑی داڑھی سامنے کی طرف مڑ گئی تھی۔ اس نے پشت در پشت اس گھر کا نمک کھایا تھا۔ "ہاں ہاں، بھیاجی، آپ کچھ سوچ رہے ہو۔ آپ سوچ رہے ہو یہ رات خوبصورت ہے۔"

"مجھے یہاں کوئی رات بری نہیں لگتی۔" میں نے جواب دیا۔" کیا ہم اپنے شہر سے بھاگ کر اس لیے آتے ہیں کہ یہاں راتیں بری نظر آئیں۔"

"کیا شہر میں راتیں اتنی بری ہوتی ہیں؟"

''بہت بری۔'' میں نے کہا۔''وہاں ایک خوف کا ماحول قائم رہتا ہے جو رات آتے ہی اور بھی خوفناک ہو جاتا ہے۔ آپ لوگ جو یہاں رہتے ہیں اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہمیں کیا کھونا پڑتا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی جیسے اسے اس بات کا یقین نہ ہو ورا صطبل کی طرف چلا گیا۔

جانے کیوں اس وقت مجھے اس کی مسکراہٹ کچھ بے معنی سی لگی۔ میں نے جادوئی پیڑ کی طرف دیکھا، وہاں جگنو کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ برامدے کے آخری سرے تک چل کر میں اجڑے ہوئے لان میں اترا اور ٹہلنے لگا۔ باہر کی ہوا سے میں اپنے پھیپھڑوں کو تازہ دم کر رہا تھا جب میں نے دیکھا ایک آدمی اس جادوئی پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''کون ہیں آپ؟'' میں نے اس کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اس جادوئی پیڑ سے دور رہنا ہی اچھا ہے۔'' میں نے نرم دلی سے کہا۔

''اچھا!'' اس نے جواب دیا۔ اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور وہ قدرے مضطرب نظر آیا۔''تو یہ ایک جادوئی پیڑ ہے۔ اس پیڑ میں کیا جادو ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔''لوگ کہتے ہیں اس کے پتے بارا ماہ گرتے رہتے ہیں اور اس پر جگنو کے غول کے غول اترتے ہیں۔ یہی نہیں، ارغوانی رنگ کی گلدم چڑیاں اس کے پھولوں کا رس پینے آتی ہیں۔''

''پتوں کا سارا سال گرنا، اسے تو میں سمجھ سکتا ہوں۔ مگر جگنو غول کی شکل میں نہیں اترا کرتے۔ یا اترتے ہیں؟''

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''واقعی؟'' وہ زور سے ہنسا اور پیڑ سے الگ ہوتا نظر آیا۔''میں تمھارے نانا کا قانونی مشیر ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار آچکا ہوں۔ مجھے اس باغ میں ایک آدھ جگنو دکھائی تو دیے مگر کبھی کوئی جگنو کا جھنڈ نظر نہ آیا۔ ویسے میں ایک ایسے پیڑ کو جانتا ہوں جو میرے شہر میں ایک سنسان سڑک پر کھڑا ہے۔ اس کے پتے سارا سال جھڑتے رہتے ہیں بلکہ کسی کسی خاص دن درخت کے سارے کے سارے پتے آدھے گھنٹے کے اندر دیکھتے دیکھتے جھڑ جاتے ہیں اور زمین پر پتوں کا قالین سا بچھ جاتا ہے۔ اس پیڑ کے عجیب و غریب رنگ کے پھول اس کے موٹے تنے پر جھاڑیوں کی شکل میں اگ آتے ہیں جن کے بارے میں لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان کا کیا کریں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مویشی تک ان پھولوں کو سونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔''

ہم برامدے کی طرف واپس لوٹ رہے تھے جب ان کا بلاوا آگیا۔ انھوں نے لاچارگی سے کندھے ہلائے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نانا کے ذاتی کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

میں ان کے تعاقب میں تھوڑی دور گیا، پھر ان سے میری دلچسپی ختم ہوگئی۔ میں نے سوچا، اس گھر میں تو لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر کسی کے ساتھ اس جادوئی پیڑ کی گفتگو کی جائے۔

○ ○ ○

کل ملا کر دیکھا جائے تو یہ میری زندگی کے بہترین سال تھے۔ میں انجینئرنگ کی ڈگری کے لیے اپنے ہی شہر کے ایک کالج میں داخلہ لے چکا تھا۔ یہ انجینئرنگ کالج نیا نیا کھلا تھا اور شہر سے کافی دور واقع تھا۔ وقت بچانے کے لیے ابو نے مجھے ایک موٹر سائکل خرید دی تھی جس پر بیٹھا میں ہوا کے دوش پر سوار اڑا کرتا۔ یہی نہیں، میں نے

فریدہ سے پہلی بار اپنی محبت کا اظہار بھی کیا تھا۔فریدہ جو سانولے رنگ کی،ایک مریل سی بیوقوف لڑکی تھی اور ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔اس کے گھر والوں سے ہمارے گھریلو تعلقات تھا۔میں اسے پسند کرتا تھا،خاص طور پر اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو جن سے ایک عجیب قسم کی روشنی نکلتی رہتی۔

ہمارا محلہ مسلمانوں کا تھا،اس کے گلی کوچے ہر وقت لوگوں سے بھرے رہتے، نالوں کی سڑاندھ اور بیف ہوٹلوں سے مہکتے رہتے،بچوں کی گالیوں،رکشوں کی گھنٹیوں اور اذانوں سے گونجتے رہتے۔فریدہ اور ہم ایک ہی اسکول سے پڑھ کر نکلے تھے اور اب وہ لڑکیوں کے کالج میں بی اے میں داخلہ لے چکی تھی جب کہ میں شہر کے دوسری طرف ایک دوسری طرح کے کالج میں پڑھ رہا تھا جو نہ صرف کافی بڑا تھا بلکہ اس کا اپنا خود کا ایک ہاسٹل تھا۔اس میں دور دور سے لڑکے پڑھنے آتے۔مجھے اس کالج کے پیڑ پسند نہیں تھے۔ان میں کوئی خاص بات نہ تھی۔یہ پیڑ نئے تھے اس لیے ان میں ابھی شاخیں نمودار نہیں تھیں۔سدا بہار پیڑوں کی نسل سے ان کا تعلق ہونے کے سبب پتے مشکل سے ٹہنیوں سے نیچے اترتے۔

''اور ہمارے کالج میں ایک بھی پیڑ نہیں ہے۔'' فریدہ اوڑھنی کا پلو سر پر لیتے ہوئے بولی۔میں نے محسوس کیا تھا کہ اب مجھے دیکھتے ہی وہ یہ انداز اپنا لیتی۔''پرانے دروازوں دریچوں والا ایک ماچس کا ڈبہ جس کے کمرے بریانی سے مہکتے رہتے ہیں۔''

مجھے پتہ تھا وہ جس کالج میں پڑھا کرتی تھی وہ ایک مسلم ادارہ تھا جہاں ہر دوسرے تیسرے دن شادی یا ولیمہ یا عقیقہ یا سنت یا میلاد یا مشاعرہ یا سالگرہ یا مذہبی اجتماع ہو جایا کرتا۔اس کے مقابلے میں ہمارا کالج صاف ستھرا تھا،شہر سے دور جہاں ان چیزوں کی اجازت نہ تھی،گرچہ مجھے اس کے پیڑ پسند نہ تھے۔

''ایسے درختوں کے مقابلے میں جو ہمیں ناپسند ہوں درختوں کا نہ ہونا زیادہ اچھا

ہے۔" میں اس کا دل رکھنے کے لیے کہتا اور اس کے چہرے کی طرف تاکتے ہوئے حیرانی سے سوچتا، میری محبت کے اظہار کے بعد بھی وہ بدل کیوں نہیں گئی تھی؟ وہ کیوں وہی بیوقوف، مریل، سانولے رنگ کی، بیباک مگر روشن آنکھوں والی فریدہ تھی جس پر میں مرمٹا تھا۔ مجھے سنجیدگی سے اسے احساس دلانا ہوگا کہ میری محبت سچی ہے، کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے اور اسے اس کے حسب حال بدل جانا چاہیے۔ مگر فریدہ دن بدن اور بھی بے وقوف، اور بھی مریل ہوتی جارہی تھی اور اس کی مناسبت سے اس کی آنکھیں اور بھی روشن ہوتی جارہی تھیں۔

اس کے باپ کی دوا کی ایک بہت چھوٹی سی دکان تھی جہاں بیٹھا وہ مکھیاں مارا کرتا۔ وہ اپنے ڈھیر سارے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی اور اکثر وہ اپنی دونوں روشن آنکھوں کو بند کر کے مجھ سے سوال کیا کرتی:

"تم صرف دو بھائی بہن کیوں ہو؟"

"تم نے پوچھتے وقت آنکھیں کیوں بند کر لی ہیں؟"

"کہاں؟" وہ آنکھیں کھول دیتی اور میں حیران رہ جاتا کیونکہ انھیں کھولنے کے بعد مجھے ایسا لگتا جیسے وہ ایک دوسری لڑکی میں بدل گئی ہو۔

"اگر تم جواب نہیں دینا چاہتے تو میں نہیں پوچھونگی۔" اس نے پھر سے آنکھوں کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہ کیوں جاننا چاہتی ہو؟" میں نے انگلیوں سے اس کے پپوٹوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ شاید مجھے بند آنکھوں والی فریدہ پسند نہ تھی۔ "مجھے اس کا جواب نہیں معلوم۔"

"تم اتنے بڑے کالج میں پڑھتے ہو۔" اس نے مسکرا کر میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "اور حال یہ ہے کہ تمھیں کچھ بھی نہیں معلوم۔"

''ہاں مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' میں نے کہا۔''اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تمھارے دل میں کیا ہے؟''

''میرے دل میں کیا ہے؟'' وہ ہنستی۔''دل میں کیا ہوتا ہے؟ عجیب ہو تم۔ کیا دل میں کچھ ہونا ضروری ہے؟ کیا کچھ ہوئے بغیر دل دل نہیں ہوتا؟''

اکثر مجھے لگتا، فریدہ اتنی بیوقوف نہیں جتنی وہ نظر آتی ہے، یا جتنی میں اسے سمجھتا ہوں۔ میرا اس کے گھر میں آنا جانا اتنے دنوں کا تھا کہ کسی کو ہمارے بارے میں سوچنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ لوگ ایک پرانے پشتینی مکان میں رہتے تھے جس کی دیواریں شکستہ ہو چکی تھیں اور دروازے اور دریچے اپنے سارے رنگ و روغن سے محروم مایوسی سے جھک سے گئے تھے۔ اس کی ماں ہمیشہ کی بیمار ایک جاوداں طور پر حاملہ عورت تھی۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تم اپنی ماں ہو۔'' میں اسے چڑھانے کے لیے کہتا۔''مگر شادی کے بعد کیا تم بھی اتنے سارے بچے پیدا کرو گی؟''

''اگر کرلوں تو؟'' وہ جواب دیتی۔''ارے ہاں، پھر تو میرے بچے تمھارے جیسے بڑے کالج کی بجائے بریانی سے مہکتے اسکولوں کالجوں میں پڑھتے نظر آئینگے۔''

مجھے اس کا بچوں کے بارے میں اس طرح کھل کر گفتگو کرنا اچھا لگا تھا۔ گرچہ یہ اس کی فطرت کے خلاف نہ تھا۔ اس کی اسی بیباکی نے تو میرا دل موہ لیا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ میرے دل کا حال جانتی ہے، مگر کوئی بڑی وجہ اسے آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ ایک دن وہ بری طرح بیمار پڑی اور مرتے مرتے بچی۔ میں نے اس کا گھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس کا بستر میں پڑے رہنا دیکھا نہ جاتا۔ اسے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھایا بھی نہ گیا۔ گھر ہی میں نیم حکیموں کے ذریعے اس کا علاج چلتا رہا اور دھیرے دھیرے وہ تندرست ہوگئی۔ بیماری کے بعد میں نے محسوس کیا اس کی دونوں آنکھیں (جن کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے) پہلے سے زیادہ بڑی ہوگئی تھیں جیسے

انھوں نے خوف کو بہت قریب سے دیکھ لیا ہو۔ وہ پھر سے کالج جانے لگی۔ شروع شروع رکشا میں، پھر پیدل۔ پھر ایک دن اس نے کالج جانا بند کر دیا اور مجھے خبر ملی کہ اس کی شادی طئے کر دی گئی ہے۔

مجھے شدید جھٹکا لگا۔ ابھی تو ہم صرف طالب علم ہی تھے۔ کیا اتنی جلد یہ سب کچھ ہونا ضروری تھا؟

''احمد کیا کرے۔ اس کی اتنی ساری لڑکیاں ہیں۔ ایک ایک کر کے سب کو نپٹانا تو ہوگا۔'' میرے باپ نے کھانا کھاتے کھاتے اماں سے کہا۔ ''لڑکے والوں کا مرغی کا بڑا کاروبار ہے۔ لڑکا طلاق شدہ ہے، دہیز وغیرہ کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ لیکن میں نے سنا ہے۔ بہت بڑا کنبہ ہے اور بڑے پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔''

کالج کے اکتا دینے والے درختوں کے نیچے چلتے چلتے اکثر میں سوچتا رہتا، کتنی جلد سب کچھ بدل جاتا ہے۔ لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں، سسرال چلی جاتی ہیں، مائیں بن جاتی ہیں، مگر یہ پیڑ کہیں نہیں جاتے۔ اپنی جگہ کھڑے ایک سے پتے ایک سے پھل پھول اگاتے رہتے ہیں۔ میں نے سر اٹھا کر ان پیڑوں کا ایک بالکل ہی نئی نظر سے جائزہ لیا جو قطار در قطار کھڑے ہوا میں دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ مجھے پہلی بار ان سے ایک عجیب انسیت کا احساس ہوا۔ یہ پیڑ جو کبھی نہیں بدلتے، کتنے وفادار ہوتے ہیں، ان کے ہوتے ہمیں کسی محرومی کا احساس نہیں ہوتا۔ میرے کالج کے دوست ان پیڑوں کے نیچے کھڑے لڑکیوں پر آوازے کستے مگر پیڑ اپنی جگہ خاموش کھڑے رہتے، ایک ایسی دریا دلی کے ساتھ جیسے ان کے سامنے یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال ہو۔

برسات کی پہلی بارش ہو چکی تھی جب ہاسٹل کے باہر فٹ بال کے میدان میں لکڑی کے اسٹینڈ پر بیٹھے بیٹھے میں نے سگریٹ کا پہلا کش لیا۔

''!Bravo'' میرے ساتھیوں نے مجھے کھانستے دیکھ کر میری پیٹھ تھپتھپا کر تالیاں

بجائیں۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میری آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ میں نے مزید کئی کش لگائے۔ اب مجھے اپنے پھیپھڑوں میں گرمی اور راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ جانے کیوں اس ایک سگریٹ کے بعد میری دنیا جیسے بدل سی گئی تھی۔ میں ایک نیا انسان بن گیا تھا۔

''تمھیں اس لڑکی کی عزت کرنی چاہیئے۔'' بعد میں میرے ایک قریبی ساتھی نے کہا جو اوّل نمبر کا پڑھائی چور تھا اور مجھ سے چار برس بڑا ہونے کے باوجود ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے اور کسی وجہ سے ایک دوسرے کے ہمراز ہو گئے تھے۔ ''اس نے تمھیں ایک امتحان سے بچالیا۔''

''مجھے پتہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کا مقروض ہو گیا ہوں۔''

لیکن جب میں نے ایک بار یہ بات قبول کر لی تو میرے دل میں ایک مجرمانہ احساس نے گھر کر لیا۔ کیا اس پورے عرصے میں جب میں اس کے لیے آہیں بھر رہا تھا، میں ایک درندہ تھا؟ شاید میرا دوست ٹھیک کہہ رہا تھا، فریدہ نے میری محبت سے منھ موڑ کر مجھے ایک امتحان سے بچالیا تھا۔ اس احساس نے مجھے نئے سرے سے اس کے طلسم میں گرفتار کر لیا۔ میں اس کا گھر جانے لگا تھا، مگر اب میں اس سے آنکھیں ملا نہیں پاتا، گرچہ اس کی شادی کا دن قریب آتا جا رہا تھا۔

''تم موٹر سائکل اتنی تیز نہ چلایا کرو۔'' ایک دن فریدہ نے مجھ سے کہا۔ ''میں نے سنا ہے تم سگریٹ بھی پینے لگے ہو۔''

''میری بیوی بننے کی کوشش مت کرو۔'' میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ساری دھمکیاں اپنے شوہر کے لیے مخصوص رکھو۔''

''تمھیں ایک ضدی لڑکی کی سخت ضرورت ہے جو تمھیں راہِ راست پر لائے، تمھارا

مزاج درست کرے۔" اس نے کھلکھلا کر ہنسنے کی کوشش کی مگر مجھے اس کا ہنسنا اچھا نہ لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پیتل کی گھنٹی کو گیلی لکڑی سے پیٹ رہا ہو۔

"تم اب بھی بیمار ہو، تمھاری آنکھیں صاف بتا رہی ہیں۔" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اور شادی کے بعد تم مر جاؤ گی۔"

"سب لوگ مر جاتے ہیں۔ کچھ شادی سے پہلے، کچھ شادی کے بعد اور کچھ لوگ شادی پر شادی کرتے رہنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔"

"مذاق نہیں۔" میں نے ضد کے ساتھ کہا۔ "تم اس شادی سے انکار کر دو۔ کیا شادی ہی زندگی میں سب کچھ ہے؟ اور میں نے سنا ہے تم جہاں بیاہی جا رہی ہو وہ بہت ہی قدامت پرست لوگوں کا گھرانہ ہیں۔"

"یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خود ہم کہاں کے الٹرا ماڈرن ہیں۔"

"پھر جہنم میں جاؤ۔ اور خدا کا شکر بجا لاؤ کہ تمھاری خواہش پوری ہو رہی ہے۔"

اس کے بعد میں نے اس کا گھر جانا چھوڑ دیا، اپنی موٹر سائکل کی رفتار اور تیز کر لی اور مضافات کی سنسان سڑکوں اور جنگلوں میں پٹرول پھونکتا پھرا۔ میں کسی تالاب یا ندی کے کنارے، یا ٹیلے پر موٹر سائکل کھڑی کر کے اس کی ڈھلان میں لیٹا گھنٹوں سگریٹ پھونکتا رہتا یہاں تک کہ میں ایک بے حس و حرکت مورتی میں ڈھل جاتا اور چڑیاں پھدکتے ہوئے میرے بالکل قریب آ جاتیں، بلکہ میرے سائے میں گھس کر دھوپ سے کمہلائی ہوئی گھاس کے اندر کیڑے مکوڑے چگنے لگتیں۔ میں سوچتا، یہ چڑیاں، یہ ہم انسانوں سے زیادہ آزاد ہیں، یہ صرف آج میں زندہ رہتی ہیں، ان کے ذہنوں پر مردہ صدیوں کا بوجھ نہیں ہوتا، یہ یا تو آزاد رہتی ہیں یا مر جاتی ہیں۔

"یا پکڑ کر کسی پنجڑے میں بند کر دی جاتی ہیں۔" مجھے اپنے پیچھے سے فریدہ کے ہنسنے

کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر موڑ کر دیکھا۔ دور تک کھیت راستے اور میدان اور ان پر اگے ہوئے پیڑ پودوں اور جھاڑیوں کے علاوہ کہیں پر کچھ بھی نہ تھا، نہ کہیں آدم نہ آدم زاد۔ میں نے نیم جلے سگریٹ کو ہونٹوں کے بیچ دبا کر موٹر سائکل اسٹارٹ کی اور اڑتے ہوئے بادلوں کی دھند میں سما گیا۔

○ ○ ○

فریدہ کی شادی میں میں بری طرح مصروف رہا۔ اس کے سسرال والوں کا کافی بڑا کنبہ تھا۔ باراتیوں کا تانتا تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ جسے دیکھو اپنا ہانڈی جیسا پیٹ اٹھائے دندناتا چلا آرہا تھا۔ میں ساری رات ان کی خاطر داری میں مصروف رہا۔ صبح فریدہ کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرے گھر کے آنگن میں شامیانہ لگا کر صبح کے ناشتے کا انتظام کیا گیا تھا، جہاں میں دوسرے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ مہمانوں کو ناشتہ کروانے میں لگا ہوا تھا، جب مجھے فریدہ کی رخصتی کی خبر ملی۔ ایک لڑکے کے ذریعے گھر والوں نے مجھے بلا بھیجا تھا تاکہ اس آخری رسم کے وقت میں موجود رہوں۔ لیکن مجھے پتہ تھا، یہ گھر کے لوگوں سے زیادہ فریدہ کا کارنامہ تھا۔ جانے کون سی وجہ تھی کہ اس آخری وقت میں اسے میری ضرورت آن پڑی تھی۔ میں نے سبزی کا ڈونگا ایک شخص کے ہاتھ میں تھمایا، باہر سڑک کے کنارے کھڑی اپنی موٹر سائکل اسٹارٹ کی اور سنسان گلی کوچوں کے اندر سے تیر کی طرح نکلتے ہوئے شہر کے باہر چلا گیا۔

میرے خدا، کیا میں اپنے سائے سے بھاگ رہا تھا؟ مجھے اس کا بھی احساس نہ تھا کہ موٹر سائکل میں تیل برائے نام تھا۔

اندھیرا ہو رہا تھا جب میں پٹرول سے خالی ٹینک کے ساتھ موٹر سائکل کو ڈھکیلتا ہوا

گھر واپس لوٹا۔

میں دو دن تک گھر سے باہر نہ نکل سکا۔ تیسرے دن بند کالج مجھے کچھ زیادہ ہی سنسان لگا جیسے اچانک سب لوگ مجھے اس سیارے پر اکیلا چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔ کالج کا ہاسٹل سنسان پڑا تھا جس کے برامدے پر بیٹھا میں دو رویہ پیڑوں کی طرف تاکتا رہا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان پیڑوں کا طلسم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو گیا ہو۔

''نہیں، تم میری محرومی کا ازالہ نہیں کر سکتے۔'' میں نے انھیں اپنے ہاتھ سے رد کرتے ہوئے کہا۔ یہ کالج میں میرا آخری سال تھا۔ شادی کے بعد میں فریدہ سے دور دور رہا۔ مشکل سے ہماری ملاقات ہوتی۔ آخری بار میں نے اسے دیکھا تو اس کا حمل صاف نظر آ رہا تھا مگر اس کے چہرے کی ہڈیاں دور سے بھی پڑھی جا سکتی تھیں۔

''تم کھانا پینا ٹھیک سے نہیں کرتیں۔ میں نے سنا ہے تمھارے میاں کا مرغی کا کاروبار ہے، اچھا خاصہ پیسہ ہے تم لوگوں کا۔'' میں نے ایک دن تنگ آ کر اس سے کہا۔ ''ویسے مرنے کے لیے شادی کرنا ضروری نہ تھا، تم گھر میں بھی یہ کام کر سکتی تھی۔''

''کیا کھانے پینے سے ہی آدمی تندرست ہو جاتا ہے؟'' اس نے پھر سے ہنسنے کی کوشش کی۔ وہی پیتل کی گھنٹی پر گیلی لکڑی کی چوٹ! میں کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

کالج کے بعد ایم ٹیک کی ڈگری کے لیے میں بڑا شہر چلا گیا۔ میں بہت کم گھر آتا اور فوراً واپس کالج لوٹ جاتا۔ دیکھتے دیکھتے اور بھی دو برس گذر گئے۔ ان دو برسوں میں فریدہ کی متواتر دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ میں ایم ٹیک کی پڑھائی مکمل کر چکا تھا جب اس کی تیسری بیٹی کی پیدائش کی مجھے خبر ملی۔ میں امتحان دے کر کچھ دنوں کے لیے گھر لوٹا تھا جب مجھے یہ خبر ملی تھی۔ شاید اس کے سسرال والوں سے تعلقات اچھے نہیں جا رہے تھے۔ انھوں نے یہ بھی الزام لگایا تھا کہ لڑکی کو بچپن میں تپ دق کی بیماری تھی

اور شادی کے وقت یہ بات چھپائی گئی تھی۔ فریدہ کو بچپن میں کوئی بیماری تھی مجھے اس بات کا پتہ نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ایک مریل سی لڑکی رہی تھی۔ اس کے پاس بیمار پڑنے کے لیے جسم کہاں تھا۔

''جب تعلقات بگڑتے ہیں تو سارے گڑے مردے نکل آتے ہیں۔'' ابا نے مجھے بتایا۔'' ساری کمزوریاں اور برائیاں لڑکیوں کی ہوتی ہیں اور لڑکے، وہ تو سارے کے سارے دودھ کے دھلے ہوتے ہیں۔''

''فریدہ بھی تو کم نہیں۔'' میری ماں نے پان چباتے چباتے کہا۔'' ٹھیک سے کھانا پینا کرے، تندرست رہے۔ جب دیکھو باپ کے گھر آ کر پڑی رہتی ہے۔ تین تین لڑکیاں، بیچارے اس کے سسرال والے کب تک برداشت کریں۔''

''کیا یہ اس کے ہاتھ میں ہے؟'' مجھے اپنی ماں پر غصہ آ گیا اور میں موٹر سائکل نکال کر جواب زیادہ تر بیکار پڑی رہتی، اس کے چکوں میں ہوا بھروائی، ٹینک فل کیا اور فریدہ کے سسرال کی طرف چل پڑا۔

○ ○ ○

یہ شہر کے کیل خانے والا علاقہ تھا جدھر سے ٹرین کی پٹری گذرتی تھی۔ اس کے دوسری طرف ناہموار ڈھلانوں پر قبائلیوں کے گاؤں آباد تھے۔ وہاں گنا کے کھیت تھے اور گندے نالوں کے کنارے سؤر لوٹا کرتے۔ ایک چھوٹا سا کھپڑیل کے چھپر والا چرچ بھی تھا جو اپنی کنکریٹ کی صلیب اٹھائے کھڑا تھا۔ میں موٹر سائکل کا انجن بند کر رہا تھا جب مجھے چرچ کی گھنٹی کی دھیمی آواز سنائی دی جو انجن کے بند ہوتے ہی فوراً تھم گئی۔ مگر یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔

ان لوگوں کا گھر ایک منزلہ تھا۔ سامنے ایک بڑا سا آنگن تھا جو بیکار پڑا تھا۔ اس

آنگن میں کسی پیڑ پودے کا نام ونشان نہ تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ فریدہ نے مجھے اندر بلا لیا۔ یہ عجیب گھر تھا، جدھر بھی دیکھو سرخ پکوں کے تنگ برامدے، ان پر کھلتے بے رنگ دروازے، جگہ جگہ پیڑھے، چلمچیاں، المونیم کے بدھنے، چارپائیاں، مونڈھے۔ دروازوں پر پردے پڑے پڑے غلیظ ہو رہے تھے۔ شاید گھر کے افراد انھیں تولیہ کے طور پر بھی استعمال کرتے ہوں۔ کئی ستونوں سے بکریاں بندھی تھیں اور اپنی بھناڑی اور پیشاب سے اندر کے پختہ صحن کو گیلی کر رہی تھیں۔ اس گھر کے اندر پہنچ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ناک بھی کتنی پریشان کن چیز ہے۔

فریدہ کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ فریدہ کے اندر سے لڑکی پوری طرح غائب ہو چکی تھی۔ وہ ایک عورت میں بدل گئی تھی۔ اس کے بال بھی ہلکے ہو گئے تھے اور دونوں گال پچک جانے کے سبب دانت باہر نکل آئے تھے۔

''تم ایک لڑکا پیدا کیوں نہیں کر دیتی؟'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''تمھارا اور کام کیا ہے؟''

''کوشش تو کر رہی ہوں۔'' اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ لکڑی کچھ اور گیلی ہو گئی تھی۔ گھنٹی کی آواز بالکل دھیمی تھی۔

''وہ تو صاف نظر آ رہا ہے۔'' میں نے تپائی پر رکھے سموسوں اور جلیبیوں کی طرف تاکتے ہوئے کہا جنھیں میں نے چھوا تک نہ تھا۔ جلیبیوں پر شکر جم کر سفید ہو گئی تھی۔ نوزائدہ بچی پلنگڑی پر ایک کنارے پڑی سو رہی تھی۔ دنوں بچیاں گھر میں ادھر ادھر ہوں گی۔

''میری دوسری بچیوں کو دیکھو گے نہیں؟'' فریدہ بولی۔ ''کچھ کھاتے کیوں نہیں؟''

''میں تمھاری بچیاں دیکھنے نہیں آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اس کی طرف نہیں تاک رہا تھا۔ ''اور میں کچھ کھانے بھی نہیں آیا ہوں۔''

"انجینئر ہو گئے ہو۔ اب دوسری دنیا ہو گئی ہے تمھاری۔"

"ہاں، ہو گئی ہے۔ تم سے مطلب۔" میں نے تلملا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور تم جلد سے جلد ایک لڑکا پیدا کر دو ورنہ بیٹی جنتے جنتے مر جاؤ گی۔"

"کیا بیٹی بن کر پیدا ہونے کے بعد مرنا کوئی معنی رکھتا ہے۔" مجھے اپنے پیچھے سے اس کی آواز سنائی دی اور میرے پیروں پر جیسے زنجیریں سی پڑ گئیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو کی لکیریں بن رہی تھیں۔

میں بھاگتا ہوا اپنی موٹر سائکل تک پہنچا اور پھر وہی کھیت، جنگل، میدان، بادل، چڑیاں۔ میں ایک گھاس سے ڈھکے میدان میں ایک پیڑ کے سائے میں پیٹ کے بل لیٹا اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا۔ میرا جی چاہتا میں موٹر سائکل چلاتا ہوا خدا تک چلا جاؤں اور۔۔۔

خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ میرے چاروں طرف سوکھے پتے اڑ رہے تھے۔ ہوا جیسے مجھ سے سرگوشی میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر مجھے کسی سے کیا لینا۔

میں اسی شام واپس بڑا شہر لوٹ گیا۔

○ ○ ○

اس کی چوتھی لڑکی کی ولادت کی مجھے اطلاع ملی تو میں ایک انفارمیشن ٹکنالوجی فرم میں ملازمت لے چکا تھا اور اس کام نے میری ساری توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر اس واقعے کو اپنے ذہن سے دور کر دیا۔ حق بہ حق دار رسید۔ اب کبھی کبھار ہی میں اپنا شہر جاتا اور جاتا بھی تو ایک دو دن کے لیے اور زیادہ تر گھر میں پڑے پڑے انگریزی ناول پڑھنے میں وقت گذار دیتا جنھیں اسی مقصد سے میں اپنے ساتھ لایا کرتا۔ پھر رک سک پیٹھ پر لاد کر سیدھے اسٹیشن کی راہ لیتا۔

وقت گذرتا رہا میری چھوٹی بہن کی شادی طئے ہوگئی۔شادی کی بھیڑ بھاڑ میں میں نے فریدہ کو اپنی چاروں بیٹیوں کے ساتھ دیکھا۔اسے ہلکا ہلکا بخار تھا۔آنکھیں زرد ہو رہی تھیں۔اس کے کچھ اور بال جھڑ گئے تھے۔شادی کے دوران ہم میں بہت کم باتیں ہوئیں۔میری بہن کی رخصت کا تیسرا دن تھا۔اسے ولیمہ کے فوراً بعد اپنے شوہر کے ساتھ جدہ کے لیے روانہ ہونا تھا جہاں وہ ڈاکٹر تھا۔ہم تقریباً آدھی رات کو اسٹیشن پر انھیں چھوڑ کر واپس لوٹے۔گھر میں بالکل سنّاٹا تھا۔سب اپنے اپنے کمرے میں بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گئے تھے،صرف میری آنکھوں میں نیند کا کوسوں دور تک پتہ نہ تھا۔آخر کار میں بستر سے نکل آیا اور باقی رات میں نے گھر کے سونے آنگن میں ٹہلتے ہوئے گذار دیا۔صبح سورج نمودار ہو چکا تھا اور شاخوں کے اندر چڑیاں چہچہانے لگی تھیں جب مجھے گہری نیند نے آدبوچا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے اپنی موٹر سائکل اسٹارٹ کی اور اپنے پرانے کالج کی طرف چل پڑا۔

سورج بادلوں کے سبب آسمان میں دھندلا نظر آرہا تھا۔میں نے دیکھا،کالج کے آس پاس کے سارے کھیت غائب ہو گئے تھے۔ان میں انسانی آبادی بس گئی تھی۔دکانیں اور ہوٹل کھل گئے تھے۔کالج کے میدان کے کچھ پیڑوں میں شاخیں بھی نظر آنے لگی تھیں۔اس کے برامدے اور لان میں نظر آنے والے سارے چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔

میں نے اپنے ٹیچروں کا سامنا نہیں کیا۔

میں گھر لوٹا تو رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔

"فریدہ پھر سے بیمار ہے۔" میری ماں نے کھانا میز پر لگاتے ہوئے کہا۔"یہ لڑکی مرجائگی۔اب تو اس کے سسرال والے بھی اسے لینے نہیں آتے۔"

میں نے چپ چاپ اپنے لقمے زہر مار کیے اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں رات بھر بستر پر کروٹ بدلتا رہا اور دوسرے دن صبح صبح فریدہ کے گھر جا دھمکا۔

فریدہ ایک تختہ پوش پر پڑی بخار سے پھنک رہی تھی۔ اس کی چوتھی بچی اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی چارپائی پر دھوپ کے ایک ٹکڑے کے اندر پڑی ہاتھ پیر پھینک رہی تھی۔

''اپنی بچیوں سے نہیں کہو گی کہ تمھارے ماما آئے ہیں۔'' میں نے اس کی چوتھی بچی کو اپنی شہادت کی انگلی دیتے ہوئے کہا جسے اس نے فوراً اپنی ننھی انگلیوں سے تھام کر چوسنا شروع کر دیا۔

''کیا واقعی تم ان کے ماما ہو؟'' فریدہ نے شوخی کے ساتھ کہا۔ وہ اپنی آواز کی نقاہت کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''دیکھو فریدہ۔۔۔'' میں نے اس کا داہنا ہاتھ، جو بالکل ہڈی ہو رہا تھا اور کافی گرم تھا، اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''اب لائیگیشن کروالو۔''

''بہت درد ہوتا ہے تمھیں؟'' اس نے اپنی آنکھوں کے حلقوں کے اندر سے میری طرف تاکتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہ جو تم قسطوں میں مر رہی ہو، اس سے میں خوش ہوں۔'' میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا اتنی ساری بچیوں سے تمھارے شوہر کا جی نہیں بھرتا۔''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ اب تو ماشاءاللہ اچھی نوکری بھی ہے تمھاری۔''

''میں تم سے تھک گیا ہوں۔'' میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمھیں بچپن سے جانتا ہوں۔ بالکل ہی احمق، ضدی اور بے حس لڑکی ہو۔ میں تمھارے شوہر سے بات کروں گا۔''

"خدا کے لیے نہیں۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے پتہ ہے تم کس طرح کے لڑکے ہو۔ تم کچھ بھی کر گذرو گے۔ اطمینان رکھو۔ اب کے ضرور لڑکا ہوگا اور سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا مطلب، کیا اب بھی تمھارا زچگی کا ارادہ ہے؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"کیا تم کبھی آئینہ نہیں دیکھتیں؟ تمھارے پاس ہڈیوں کے علاوہ اور کیا بچا ہے فریدہ؟"

"خدا سے دعا مانگو، گرچہ مجھے ڈر ہے تم خدا میں بہت زیادہ یقین نہیں رکھتے۔" اس نے کہا۔ "میرا دل کہہ رہا ہے، اس بار ضرور لڑکا ہوگا۔ میرے سسرال میں پچھلے بیس برس سے کوئی لڑکا نہیں پیدا ہوا۔"

"فریدہ۔۔۔" میں اپنے الفاظ چبا رہا تھا۔ "کاش میں تمھیں کسی طرح روک سکتا۔ میرے خدا، کیا اتنی بڑی دنیا میں ایسا کوئی نہیں جو تمھیں سمجھائے، تمھارے شوہر کو سمجھائے۔ یہ کس دنیا میں جی رہے ہیں ہم لوگ؟"

"تم نے خدا کا نام لیا تو مجھے اچھا لگا۔" وہ مسکرائی۔ اب تو گھنٹی پر گیلی لکڑی کا پڑنا بھی بند ہو چکا تھا۔

"یہ صرف ایک فجائیہ کلمہ ہے یا جو بھی سمجھو۔" میں نے جواب دیا۔ "اور خدا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں ٹانگ اڑانے والی کون ہوتی ہو؟"

"اور یہ لڑکا میرا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم اس میں ٹانگ اڑانے والے کون ہوتے ہو؟"

"نہیں، یہ تمھارا ذاتی معاملہ نہیں رہا۔ اب یہ انسانیت کا معاملہ بن چکا ہے۔ میں نے سنا ہے ڈاکٹروں نے مزید زچگی سے منع کیا ہے۔ اس سے تمھاری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"ڈاکٹر کتنا جانتے ہیں۔"

''فریدہ پلیز۔'' میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمھیں یہ بے وقوفی کرنے نہیں دوں گا۔''

''تم رو رہے ہو۔'' فریدہ نے اپنی مرجھائی ہوئی انگلیوں سے میرے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ میں نے جھنجلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بے خبری میں نکل آئے آنسو کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمھارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی جگہ ہے، تو تم اس زچگی سے باز آؤ گی۔''

''میرے پیٹ میں بچہ آچکا ہے ندیم۔'' اس کی آواز آئی اور میں بھوچکا سا اپنی جگہ بیٹھا اسے دیکھتا رہ گیا۔

○ ○ ○

میرا بنگلور تبادلہ ہونے والا تھا۔ میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کر رہا تھا جب مجھے خبر ملی کہ نانا کی طبیعت کچھ علیل ہے۔

میں کئی مہینوں سے نانا کے گھر نہیں گیا تھا۔ میں نے فوراً چھٹی کی درخواست دی اور ٹرین میں بیٹھ کر نانا کے گھر چل پڑا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں یہاں کئی سالوں بعد آرہا تھا مگر یہ قصبہ جانے کیوں جب بھی میں یہاں آتا مجھے ایسا لگتا جیسے یہاں آتے ہی گھڑی کے کانٹے سست ہو گئے ہوں۔ اس میں کہیں پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی سوائے اس کے کہ اس کے اسٹیشن میں مسافروں کے لیے ایک سائبان بن گیا تھا، جب کہ خود ہمارا چھوٹا سا شہر میلوں تک پھیل گیا تھا، اس میں کئی شاپنگ مال اور فلائی اوور بن گئے تھے۔

نانا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ کافی کمزور نظر آرہے تھے مگر ان کی نقاہت پیری کے سبب زیادہ تھی۔ جاڑے میں ان کے ساتھ ایسا ایک دو بار ہو جایا کرتا۔ اما

ں کو میکے پہنچا کر ابا واپس لوٹ گئے تھے کیونکہ پرموشن کے بعد ان کے اوپر آفس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ تو ایسا گبرو جوان نکلے گا۔" نانا نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ دراصل میرا قد اور کاٹھی وہی تھا، مگر ایک تو وہ بہت دنوں بعد مجھے دیکھ رہے تھے، دوسرے نہ صرف میرے کپڑے پہننے کا ڈھنگ بدل چکا تھا بلکہ ذمہ داریوں نے میرے اندر ایک سنجیدگی اور دھیماپن ڈال دیا تھا۔ "بھئی عصمت، اب اپنے ندیم کے لیے لڑکی ڈھونڈ ہی لو۔"

"آپ ہی کچھ کیجیے۔" اماں نے میری طرف شوخی سے تاکتے ہوئے کہا۔ "ورنہ لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں نے سنا ہے بڑی خوبصورت لڑکیوں کے بیچ کام کرتے ہیں جناب۔"

"ہاں، بس یہی سمجھ لیجیے کہ لڑکا ہاتھ سے نکل گیا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور کال سینٹر میں اتنی ڈھیر ساری لڑکیاں ساتھ کام کرتی ہیں کہ لڑکی کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

نانا کے گھر کوئی موٹر سائکل نہیں تھی۔ کوچوان کے مرجانے کے بعد گھوڑے بھی بیچ دیے گئے تھے۔ صرف ان کا بوسیدہ تانگہ اپنی کمانیوں پر کھڑا دھول کھا رہا تھا۔ اسے کبوتروں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ اس کے پہیے اصطبل کی دیوار سے لگے کھڑے تھے۔

میں نے ایک کارندے سے اس کی زنگ خوردہ سائکل مستعار لی اور باہر نکل گیا۔ یہاں چاروں طرف سرسوں کے کھیت بکھرے پڑے تھے۔ جگہ جگہ نہروں میں پانی موجیں مار رہا تھا۔ یہاں کا آسمان کتنا وسیع اور نیلا تھا۔ ہمارے اپنے شہر کے مقابلے میں یہاں کی زمین بھی کافی ناہموار تھی، وہاں کی طرح نہیں کہ جہاں بھی جاؤ وہی جگہ لگے۔

شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ میں سائکل پر واپس لوٹ رہا تھا جب موبائل کی گھنٹی بجی۔ یہ ابا تھے۔ فریدہ کی حالت بہت بگڑ گئی تھی اور اسے بہت ہی نازک

حالت میں اسپتال لے جایا گیا تھا۔ ڈاکٹر وقت سے قبل سیزرین آپریشن کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اگر نانا کی طبیعت ٹھیک ہو تو ماں واپس چلی آئے۔

میں پگڈنڈی پر سائکل تھامے کھڑا اس خبر کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ نیچے ڈھلانوں سے ڈھور ڈھنگر لوٹ رہے تھے۔ ان کے پیروں سے اڑتی دھول میں سورج چھپ سا گیا تھا۔ میں تیز تیز پیڈل مارتا ہوا گھر واپس لوٹا اور ماں کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ نانا نے ہمیں صبح کی گاڑی سے نکل جانے کے لیے کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' انھوں نے ڈھارس دلایا۔ ''گرمی کا موسم آرہا ہے اور بوڑھی ہڈیوں کے لیے گرمی سے اچھا کوئی موسم نہیں ہوتا۔ ابھی سے میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا ہوں۔''

مجھے لگا وہ جھوٹ کہہ رہے تھے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا فریدہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عجیب ضدی لڑکی ہے۔ فرض کرلو اس بار بھی لڑکی ہوئی تو؟

نہیں اس بار لڑکی نہیں ہوگی، میں نے اپنی مٹھی بھینچتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اگر خدا واقعی موجود ہے، تو فریدہ کے ساتھ وہ یہ بے انصافی نہیں کرسکتا۔ میں برا ہوسکتا ہوں، نماز نہیں پڑھتا اور دکھاوے کے لیے روزے رکھتا ہوں، مگر وہ تو صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی ہے، خدا کی خوشنودگی کا خاص خیال رکھتی ہے، اسے خدا کی ذات میں مکمل یقین ہے۔ اس بار لڑکا ہوگا اور سارے معاملات صحیح ہوجائیں گے۔

ہاں، اس بار لڑکا ہوگا، میں نے برامدے میں نکل کر آسمان میں چمکتے ستاروں کے سامنے اعلان کیا۔ میرا دل کہتا ہے یہ لڑکا ہوگا اور اسے خدا بھی روک نہیں سکتا۔ فریدہ، یقین کرو، لڑکا ہی ہوگا، دوسرا کچھ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ اگر خدا ہے تو وہ انصاف پرور ہوگا اور اگر خدا نہیں ہے تو بھی یہ لڑکا ہوگا۔ کیونکہ میرے دل کی ہر دھڑکن کی آواز ہے۔ اور

۔۔۔اگر۔۔۔یہ لڑکا نہ ہوا تو فریدہ۔۔۔تمھیں مر جانے کا پورا پورا اختیار ہے۔ پھر تو تمھارے پاس جینے کا کوئی مقصد نہ بچے گا اور یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ خدا کا وجود نہیں۔

میں اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب میں نے دیکھا جادو کے پیڑ سے ٹیک لگائے ایک آدمی کھڑا میری طرف تاک رہا تھا۔

○ ○ ○

میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھا کیا۔

"میں تمھیں پہچانتا ہوں۔" اس نے اپنائیت کے ساتھ میری طرف انگلی سے اشارا کرتے ہوئے اپنے ہونٹ کھولے۔ "پہلے بھی ہماری ملاقات ہو چکی ہے لیکن اس وقت تمھاری آنکھیں اتنی غمگین نہ تھیں۔"

مجھے یاد آ گیا۔

"آپ نانا کے قانونی مشیر ہیں۔"

"ہاں۔ کچھ ویسا ہی۔ میں لوگوں کے معاملات دوسری طرح سے سلجھانے میں مدد دیتا ہوں۔"

"کیسے معاملات؟"

"کسی بھی طرح کے معاملات۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ میں کیا ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں، اس وقت تمھیں میری سخت ضرورت ہے۔"

"یہ آپ کیسے جان سکتے ہیں؟ اور آپ ہمیشہ اس پیڑ سے لگے کھڑے کیوں ملتے ہیں؟"

"مجھ سے سوال مت کرو۔ یہ جادو کا پیڑ۔ میں نے اس کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ تم نہیں جانتے، یہ کیا نہیں کر سکتا۔"

اس نے جواب دیا اور برامدے پر چلتے ہوئے نانا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے نانا کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ نانا اپنے بستر پر لیٹے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کاشتکاری کی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔

''آپ کا قانونی مشیر کہاں گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیسا قانونی مشیر؟'' نانا نے کتاب بستر پر رکھتے ہوئے کہا ''میرا وکیل تو شہر میں رہتا ہے۔ یہاں اس کا کیا کام؟''

''تو پھر وہ کون تھا؟'' میں الفاظ ادا کرتے کرتے رک گیا۔ نانا نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں ان کے بستر پر بیٹھ گیا۔ ٹیبل لیمپ کے پردے سے چھن چھن کر آتی روشنی میں وہ عینک کے اندر سے میری آنکھوں کے اندر تاک رہے تھے۔

''تم فریدہ سے بہت پیار کرتے ہو؟'' انھوں نے میرا سر سینے سے لگاتے ہوئے کہا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ میرے بالوں کو سہلاتے رہے۔

''پیار اچھی چیز ہے۔'' وہ کہہ رہے تھے۔ ''یہ ان سے پوچھو، جنھوں نے پیار نہیں کیا یا جو پیار سے محروم رہے۔ مگر شاید انھیں بھی یہ علم نہ ہو کہ انھوں نے کیا کھویا ہے۔''

میں نانا کے کمرے سے واپس لوٹ رہا تھا جب میں نے جادو کے پیڑ کو دیکھا۔ اس میں جگنو کے جھنڈ اتر رہے تھے اور ایک عجیب طرح کی روشنی اس کی شاخوں اور ٹہنیوں سے مترشح ہو رہی تھی۔ ایسی روشنی جسے میں نے ہمیشہ فریدہ کی آنکھوں سے نکلتے دیکھا تھا۔

ہاں، میں نے جادو کے پیڑ پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، وہ لڑکا ہوگا۔ میری فریدہ کو اس بار یقیناً لڑکا ہوگا۔ میں اپنی بند آنکھوں سے ابھی سے ایک صحتمند بچے کو اپنی روشن آنکھیں کھولتے دیکھ رہا تھا۔

میں گہری نیند میں تھا جب موبائل کی گھنٹی بجی۔ یہ ابا تھے۔ فریدہ کے لڑکا ہوا تھا۔ مگر فریدہ کی حالت اب بھی نازک تھی۔ وہ ابھی خطرے سے باہر نہیں کہی جا سکتی تھی۔

میں گہری نیند میں تھا جب موبائل کی گھنٹی بجی۔ یہ ابا تھے۔ فریدہ کے لڑکا ہوا تھا، مگر فریدہ کی حالت اب بھی نازک تھی۔ وہ ابھی خطرے سے باہر نہیں کہی جاسکتی تھی۔

○○○

ہم چھوٹی ٹرین میں سوار ہو رہے تھے جب ہمیں فریدہ کی موت کی اطلاع ملی۔ سورج سر پر آچکا تھا جب ہم نے ٹرین بدلی اور سارا دن سفر کرتے رہے۔ رات کے گیارا بجے ہمارے شہر کے اسٹیشن میں ابا ہمارے منتظر تھے۔ عصر کی نماز کے بعد فریدہ دفنا دی گئی تھی۔ ماں بار بار میری آنکھوں کی طرف تاک رہی تھی۔ ہم اس رات کھانا کھائے بغیر بستروں میں چلے گئے۔ ساری رات میں کھلی آنکھوں سے چھت کی طرف تاکتا رہا۔ صبح کی اذان کے بعد اچانک میری آنکھ لگ گئی۔ میں بہت دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ میں نے غسل کیا، کرتا پاجامہ پہنے اور ابا کو موٹر سائکل پر بٹھا کر (ابا اس کی سروس کروا چکے تھے) قبرستان کے لیے نکل پڑا جو شہر کے آخری سرے پر واقع تھا۔

فریدہ کی تازہ قبر شبنم سے گیلی ہو رہی تھی۔ اس کی مٹی پر چڑیوں کے پنجوں کے نشانات تھے۔ ہم دونوں نے فاتحہ پڑھا، پھر ابا دوسری قبروں کی طرف فاتحہ پڑھنے نکل گئے یا شاید انھوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔

میں اپنی جگہ کھڑا فریدہ کی قبر کی طرف تاکتا رہا۔

اطمینان رکھو! مجھے فریدہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اب کے ضرور لڑکا ہوگا اور سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔

میں نے آنسو گرائے نہ آہیں بھریں۔ شاید برسوں سے میں فریدہ کی اس موت کے لیے خود کو تیار کرتا آرہا تھا۔

''چلو گھر چلتے ہیں۔'' مجھے ابا کی تھکی تھکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے لوٹتے وقت

آخری بار فریدہ کی قبر پر نظر ڈالی۔ مجھے ایسا لگا جیسے فریدہ قبر کے اندر لیٹے لیٹے اپنی روشن آنکھوں سے میری طرف تاک رہی ہو۔

ابا کو گھر کے سامنے اتار کر میں شہر سے باہر چلا گیا اور سورج ڈوبنے تک موٹر سائکل کو بے مقصد ساویرانوں میں دوڑاتا پھرا۔

دوسرے دن میں فریدہ کے سسرال گیا۔

وہی بنجر سا بغیر پیڑ پودوں والا کٹھور آنگن، وہی دروازوں پر جھولتے غلیظ پردے، گملے، چلمچیاں، پیڑھے، ستونوں سے بندھی بکریاں۔ گھر میں دوسرے دن چہارم کی تیاری ہو رہی تھی۔ ہر طرف مہمان اور مفت خورے بھرے پڑے تھے۔ مرغی فروشوں کے چہروں پر غم کے بادل تو چھائے ہوئے تھے مگر ان بادلوں کے پیچھے اولادِ نرینہ کی خوشی کا سورج بھی چمک رہا تھا۔

فریدہ کا دو دن کا لڑکا اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھا اس کے مالش کئے ہوئے بدن اور تیل سے چپچپائے ہوئے چہرے کی طرف تاکنے لگا جس پر کالکھ کا ایک بڑا سا ٹیکہ دمک رہا تھا۔ یہ چہرا فریدہ کا نہ تھا مگر اس کی آنکھیں بالکل فریدہ کی آنکھوں کی نقل تھیں، انھیں کی طرح بڑی بڑی اور روشن۔ وہ سیدھے میری آنکھوں میں بیباکی سے تاک رہی تھیں۔

''اس طرح میری طرف مت دیکھو۔'' میں نے ان روشن آنکھوں سے کہا۔ ''تم ہمیشہ کی ایک ضدی اور احمق لڑکی ہو۔''

''لیکن میں نے کیا کہا تھا، سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' فریدہ اپنی روشن آنکھوں سے میری طرف تاکتے ہوئے بولی۔ ''میں جیت گئی نا؟''

''ہاں، تم جیت گئی فریدہ کیونکہ تم لڑکیاں ہارنا جانتی ہو۔'' میں نے جھک کر بچے کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔'' اور میں ہار گیا

کیونکہ ہم لڑکوں کو شکست کھانا نہیں آتا۔"

جاڑے کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میں ٹرین کی کھڑکی کے سامنے بیٹھا پیچھے کی طرف شتابی سے بھاگتے درختوں کی طرف تاک رہا تھا جن کے پتوں کی سرخ اور زرد رنگت خزاں کی آمد کی اطلاع دے رہی تھی جب میرے سامنے کی سیٹ پر بیٹھے طالب علم نے جو بہت دیر سے میری طرف غور سے تاک رہا تھا میری طرف جھک کر کہا۔

"سر، آپ اتنے غمگین کیوں نظر آرہے ہیں؟"

"کیا واقعی۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "کیا اس دنیا میں غمگین ہونے کے لائق کچھ ہے؟"

○ ○ ○

صدیق عالم کی پچھلی کتابیں

آخری چھاؤں (افسانے)

چار رنگ کی کشتی (ناول)

لیمپ جلانے والے (افسانے)

Bain

Siddique Alam

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com

ISBN 978-93-81029-66-4

9 789381 029664

A for Arshia Publications